اس دائرہ میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا۔ اب آپ سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں، یا وی پی کی اجازت دیں تاکہ اگلا شمارہ وی پی سے بھیجا جائے۔

پندرہ روزہ

تعمیر حیات لکھنؤ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۲
شمارہ ۱۱
سالانہ ۷/ روپے
فی پرچہ ۳۰ پیسے

۱۰ راپریل ۱۹۶۵ء مطابق ۷ رذی الحجہ ۱۳۸۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ

محمد الحسنی

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم — الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

یہ سطریں لکھتے وقت قلم کا جگر شق ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی تبلیغی تحریک کے رہنما شیخ وقت اور عالم ربانی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ؒ ربع صدی تک مسلسل سفر، مسلسل جدوجہد، مسلسل دعوت اور مسلسل نقل وحرکت کے بعد اب خدا کے جوار رحمت میں آرام کر رہے ہیں ۔

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

یا أیتها النفس المطمئنة ارجعی إلى ربك راضية مرضية فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ؕ

اللہ کے اس مقبول و برگزیدہ بندے نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی جس امانت کو ان کے دوران علالت میں اپنے سینے سے لگایا تھا اس کو آخر دم تک اس وفاداری سے نباہا کہ عشاق و محبین، اس راہ کے فدائیوں اور وفاداروں اور محبت کا دم بھرنے والوں کو بھی اس پر رشک آئے، اور بڑے بڑے اہل عزیمت و اہل محبت اس حالت کی تمنا اور اس سعادت کے حصول کی دعا کریں۔

مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا وصف اور سب سے بڑا کارنامہ نہ تبلیغی کام کی وسعت و عمومیت ہے اور نہ مردم سازی و تربیت۔ ان کا امتیاز یہ نہیں کہ انھوں نے اس کام کو ہندوستان سے نکال کر ممالک عربیہ، چین، جاپان اور یورپ و امریکہ تک پہنچا دیا اور نقل وحرکت اور دوروں کو اس قدر وسعت دی کہ اگر اس کا مالی حساب لگایا جائے تو شاید کروڑوں تک پہنچے ...... اس کام کی وسعت و ترقی کی اہمیت اور اس کے زبردست نتائج سے کوئی انکار نہیں، لیکن مولانا کا سب سے بڑا وصف اور ان کا اصل امتیاز دو چیزوں میں مضمر ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن میں مبلغین و اہل دعوت و اصلاح کے حلقہ میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نظر نہیں آتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "رتبۂ بلند" اس عہد میں انھیں کے ساتھ مخصوص رہا۔

ایک یقین کی طاقت، دوسرے تبلیغ و دعوت میں مکمل فنائیت

ان کا اصل موضوع اور ان کے دل کی آواز "یہی یقین" تھا اور یہ یقین ان کے رگ و ریشہ میں اس طرح پیوست ہوگیا تھا کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ یا کوئی گوشہ اس سے خالی نہ تھا۔ ایسا نہ تھا کہ گوشۂ تنہائی یا عبادت و ریاضت کے وقت تو یہ یقین ان کو حاصل ہو لیکن اقتدار کی قوت، وجاہت و دولت اور علم و فلسفہ کے سامنے یہ یقین ان کا ساتھ چھوڑ دے۔ اپنے مبلغین و محبین کے سامنے یہ یقین پوری قوت کے ساتھ جلوہ ریز ہو اور وزراء، اہل حکومت یا اہل دولت کے سامنے اس میں اتنی قوت باقی نہ رہ جائے، یہ یقین اس وقت تک تو حاصل ہو جب تک اس کو آزمانے کا موقع نہ آئے، اور امتحان و آزمائش کے وقت بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

مولانا نے ایک مرتبہ دعوت کے شرائط و آداب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب دو آدمی ملتے ہیں تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی کسی سے متاثر نہ ہو، یا آدمی متاثر کرتا ہے یا متاثر ہوتا ہے۔ درمیان میں کوئی درجہ نہیں ہے، اس لئے اگر تم مخاطب کو متاثر نہیں کرسکے تو یہ سمجھو کہ تم غیر ارادی طور پر خود اس سے متاثر ہوچکے ہو۔"

یہ بات سب سے پہلے خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر صادق آتی ہے۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے اسی قوت، اسی یقین، اسی صراحت، اسی دلسوزی اور اسی سطح سے بات کرتے تھے جو کلام نبوت کے شایان شان اور منصب علماء کے لائق اور مناسب ہو، وہ جس طرح ایک عامی سے بات کرتے تھے اسی طرح ایک وزیر یا سفیر یا ایک کروڑ پتی اور بڑے سیاسی سے بات کرتے تھے۔ بلکہ شاید اس سے زیادہ صراحت اور قوت کے ساتھ!

پاکستان میں ایک مرتبہ بعض مخلصین و اہل تعلق نے جو حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، ایک مخصوص اجتماع کیا اور اس میں وزراء، حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار اور ممتاز ترین شخصیتوں کو مدعو کیا، مولانا تشریف لائے تو ان سب کا تعارف کرایا گیا کہ آپ فلاں وزیر ہیں، آپ اس محکمہ کے سکریٹری ہیں، آپ فلاں جگہ کے ڈائرکٹر ہیں، جب

کا سلسلہ ختم ہوا تو مولانا نے بات اس طرح شروع فرمائی
بھائیو! ابھی آپ نے معلوم نہیں کن کن
عہدہ داروں کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد
آپ نے چند جانوروں کا نام لیکر فرمایا۔
ہاں اگر آپ یوں تعارف کراتے تو شاید میں
زیادہ سمجھ جاتا۔ جن حضرات نے ان لوگوں
کو مدعو کیا تھا ان کے سر مارے ندامت اور
خوف کے جھکے ہوئے تھے کہ اس بات کا کیا
اثر ہوتا ہے مولانا نے عجیب موثر اور دلنشین
انداز سے فرمانا شروع کیا کہ میرے بھائیو اور دیرینہ
مسلم بھی ہوتا ہے اور غیر مسلم بھی، ڈاکٹر مسلم بھی ہوتا ہے اور غیر مسلم
بھی اسی طرح تمام جنوں کا حال ہے۔ اس میں
ہماری اور آپ کی کوئی خصوصیت نہیں،
ہمارے اسلاف کا جب بھی تعارف کرایا
جاتا تھا تو یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ اتنی ملوں کا
مالک ہے، اتنی کوٹھیوں کا مالک ہے اور اتنی
موٹروں کا مالک ہے، بلکہ یوں تعارف ہوتا
تھا کہ یہ بدری ہیں انھوں نے احد میں حصہ لیا
تھا انھوں نے فلاں غزوہ میں حصہ لیا تھا اور
یہ اتنے غزوات میں شریک ہوئے تھے اور انھوں
نے دین کیلئے یہ یہ قربانیاں دیں" اسی درد مندانہ
اور مخلصانہ انداز میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ
تقریر کی۔

جن لوگوں نے یہ جلسہ بلایا تھا وہ منتظر تھے کہ
دیکھیں مولانا کی اس تقریر کا کیا رد عمل ہوتا ہے اور یہ لوگ کتنے
غیظ و غضب کے عالم میں واپس جاتے ہیں لیکن اس کا رد عمل تحرف
یہ ہوا کہ شام کے عمومی اجتماع میں نہ صرف خود وہ لوگ موجود تھے
بلکہ اپنے ساتھ دوسرے عہدہ داروں کو بھی لائے تھے اور اسٹیج
پر ڈورار کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی جو اس مخصوص
اجتماع میں تھی۔

یہ یقین مولانا کے سینے سے چشمہ کی طرح ابلتا اور
کسی وقت (کسی دن یا کسی ہفتہ کا ذکر نہیں) اس کا سوتا
خشک نہ ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ یہ سب اپنی آنکھوں
سے دیکھ کر کہہ رہے ہیں اور یہ ان کا ایسا حال اور واقعہ ہے
جس کے لئے کسی تصنع اور تکلف کی ضرورت نہیں۔

یہ یقین ان کے پاس بیٹھنے والوں یا ان کی تقریر
سننے والوں کو اس طرح متاثر کرتا کہ بعض وقت انکے مضامین
اور ان کی تقریریں پوری طرح نہ سمجھنے اور ذوق و طرز بیان کے
اختلاف کے باوجود وہ اس کی گرمی اور حرارت کو اپنے سینہ میں منتقل
ہوتے ہوئے محسوس کرتے تھے یا کم از کم اتنا ضرور سمجھ لیتے تھے کہ اس شخص

کو یقین کی جو دولت حاصل ہے وہ کم لوگوں کے پاس ہے۔
نجی گفتگو ہو یا عمومی، ایک لاکھ کا مجمع ہو یا ایک سو کا
مولانا ہمیشہ یکساں طرز اور یکساں قوت کے ساتھ بات کرتے
تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے موضوع سے نہ ہٹتے تھے
وہ باتیں جو اس مادیت کے دور میں نامانوس ہیں اور جن سے
اچھے اچھے علماء اور دینی رہنما مصلحت کے خیال سے یا
زمانہ کے رجحان سے مجبور ہو کر یا انسان کی مادی ترقی سے
مسحور ہو کر پرہیز کرنے لگے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا ذکر انکی
تحریروں اور تقریروں میں کم سے کم آئے اور زیادہ زور مسلمانوں
کے سیاسی و معاشی مسائل اور اسلام کے جمہوری تمدنی مسائل
پر دیا جائے اور اُس کو محض ایک سیاسی تحریک، ایک
معاشرتی نظام ایک اقتصادی تنظیم اور ایک تمدنی ارتقا
کے طور پر پیش کیا جائے۔ وہ باتیں مولانا بلا کسی جھجک
کے اور بغیر کسی معذرت کے اپنی پوری قوت کے ساتھ
پیش کرتے تھے بلکہ یہی ان کی ہر گفتگو اور تقریر کا محور ہوتا
آخرت پر یقین، خدا کے وعدہ پر اعتماد، توکل، جنت
کا تذکرہ اہل جہنم کے واقعات، غیبی حقائق اور انسان
کی روح کی اہمیت، مادیت کا انکار، دنیا اور آخرت
کا مقابلہ اور رسول اللہ و صحابہ کرام کی زندگی اور ان
کی مثالیں اور نمونے، دعوت کی طاقت اور اس کی
تاثیر و تسخیر، یقین کی اہمیت اور اس کے محیر العقول
واقعات یہ چیزیں تھیں جن پر مولانا کی تقریر مشتمل ہوتی تھی
لیکن اس عقل پرست بلکہ ہوس پرست عہد میں اور
اس بدلے ہوئے ذوق و رجحان کے باوجود ان کی یہ باتیں
ہر طبقہ اور ہر حلقہ کو کسی نہ کسی پہلو سے ضرور متاثر کرتی تھیں
اور اس کا سب سے بڑا راز مولانا کی قلبی قوت اور یقین
کی طاقت کی تھی جو ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی تھی،
اور پرستاران عقل اور گرفتاران نفس کو متاثر کے بغیر نہ
رہتی تھی۔

اس کے ساتھ دوران گفتگو اور دوران تقریر میں ایسے
معانی کا ورود ہوتا جس کو آورد اور تکلف یا نکتہ آفرینی سے
کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اور طاقت
ان سے یہ مضامین اور حقائق و معارف بیان کروا رہی
ہے وہ صرف اس کے ناقل ہیں،

گفتہ او گفتۂ اللہ بود ٭ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

مولانا کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ ایمان و یقین کے بغیر
امت محمدی میں کوئی تغیر اور انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا
اور اگر اس کے بغیر کوئی کوشش کی گئی تو وہ اسلام کی روح
اور اس امت کے مزاج اور اس کی تاریخ و تجربہ کے خلاف
ہو گی جس کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ایمان ہی کے سہارے یہ امت

آگے بڑھی اور بحر و بر پر چھا گئی۔ اور ایمان ہی کے کمزور ہونے
اور خدا سے خاص رشتہ منقطع ہونے کے بعد اس کا شیرازہ
منتشر ہوا اور اس کو اپنی پناہ گاہوں میں واپس جانا پڑا

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

مولانا کی دوسری اہم خصوصیت دعوت میں انہماک
کامل بلکہ فنائیت تامہ ہے اور یہ دراصل اسی پہلی خصوصیت
کا پرتو اور عکس ہے۔ اس یقین نے مولانا کو اس درجہ بے چین
مضطرب اور سیماب وش بنا دیا تھا کہ ان کو کسی پہلو قرار نہ
آتا تھا اور اس یقین کی اشاعت اور تبلیغ و دعوت ان
کے لئے اتنی ہی ضروری ہو گئی تھی جیسے انسان کے لئے
غذا اور ہوا، ان کی پوری زندگی اسی دعوت سے عبارت
تھی اور وہ اسی کے سہارے جی رہے تھے، رات کے ایک مختصر
وقفہ اور مختصر قیلولہ کے سوا ان کا سارا وقت اسی فکر اور
اسی تڑپ میں گزرتا تھا۔ جماعتوں کی تشکیل، وفود سے
ملاقات، ان کی رخصتی کی دعا، دعوت کی حقیقت اور
اس کے شرائط و آداب اور ایمان و یقین پر مسلسل تقریریں
درس حدیث اور مسلسل گفتگوئیں اور خورد و نوش یہ ان کے
شب و روز کا معمول تھا۔ دیر رات تک یہ سلسلہ جاری
رہتا جہاں کچھ نئے لوگ آجاتے بس بہار آجاتی، مولانا
چاہتے کہ اپنے سینہ کی ساری قوت اور اپنے دل کا سارا درد
کھینچ کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ کام کی نوعیت کی وجہ
سے آنے جانے والوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا اس لئے مولانا کی
گفتگو برابر جاری رہتی۔ تقریروں کے بعد مولانا بڑے اہتمام
اور درد و سوز سے طویل دعا کرتے، اور سننے والوں کی
آنکھیں نم اور دل گرم ہو جاتے بعض شدت اثر یا فرط ندامت
سے بے ساختہ رو پڑتے اور آنکھوں کو غسل صحت دیتے،
یہ دعائیں اپنی تاثیر و قوت کے لحاظ سے اور مانگنے والے
کے خلوص و یقین، دل شکستگی اور شان بندگی اور بیکسی
و بے چارگی ساتھ ناز و اعتماد کی وجہ سے تقریروں سے
کسی طرح کم نہ تھیں اور بہت سے لوگ جو بعض وقت
مشغولیت کی وجہ سے ان تقریروں سے محروم ہو جاتے
اس دعا کو غنیمت اور حاصل تقریر اور اپنی آمد کا سب
سے بڑا فائدہ سمجھتے۔

مولانا ان جلسوں کو بالکل لاحاصل سمجھتے تھے جن
کے بعد عمل کا کوئی قدم آگے نہ بڑھے۔ تبلیغ کے جلسوں میں
بھی جہاں انھیں بلایا جاتا وہ پہلے سے وعدے لیتے
کہ کتنے آدمی دینے ہوں گے یا کتنی جماعتیں نکالنی ہونگی
شب و روز کے ان معمولات کے علاوہ اسفار
اور دوروں کی ایک مسلسل زنجیر تھی جو ختم ہونے کو نہ
آتی تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغی جماعت ان ہی

(بقیہ ص ۱۵ پر)

اسوۂ ابراہیمی اور شیوۂ آزری

سعید الرحمن الاعظمی

ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام دنیا میں اس وقت آئے
جب معصیت کا بازار ہر طرف گرم تھا۔ گھر سے لیکر باہر تک
ساری دنیا بس ایک کام میں مشغول تھی، اور وہ تھا بت
سازی اور بت پرستی کا کاروبار۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے باپ آزر بت پرست ہونے کے ساتھ ہی ایک بڑے
ماہر بت تراش اور اپنے زمانے کے فنکار بھی تھے، پورا ماحول
اسی بت سازی اور بت پرستی کی لعنت میں گرفتار تھا،
انسان کی معراج ہی یہ تھی کہ کم از کم اگر وہ بت ساز
نہیں ہے تو بت پرست ضرور ہو۔ اس وبا نے تمام
انسانوں کو بری طرح گھیر رکھا تھا، اور ہر شخص اپنے حقیقی
ماحول سے دور بہت دور ایک ایسی خار دار وادی میں
بھٹک رہا تھا جہاں بجز معدہ و مادہ کے کسی اور بات کا
گذر نہ تھا، اور لوگ اس کے علاوہ کسی اور چیز سے آشنا
بھی نہیں تھے۔

حرص و ہوس سے جکڑے ہوئے اسی ماحول میں ابراہیم
علیہ السلام نے آنکھ کھولی، انھوں نے اپنی حقیقت آشنا
نگاہوں سے اس گھٹتے ہوئے انسان کو دیکھا جو اپنی ساری
صلاحیتوں کو پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں پر صرف کر رہا تھا، انھوں
نے ایک بے جان اور بے حس و حرکت بت کے سامنے لوگوں
کو اپنی پیشانیاں ٹکاتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے اس محدود
اور مقید ذہن کو دیکھا جو ایک تنگ دائرے کے ارد گرد گھوم
رہا تھا، اور جس کا مطمح نظر صرف معدہ تھا اور مادہ کی ایک
گھناؤنی شکل جس کا مرکز توجہ و التفات تھی۔

یہ ساری باتیں انسان کے فطری وظیفہ کے بالکل
خلاف تھیں اور دوسرے الفاظ میں انسانی فطرت سے جنگ کے
مرادف تھیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی فطری قوت سے
ان تمام مادی طاقتوں کو چیلنج کیا۔ انھوں نے بت پرستی اور
بت سازی کی مخالفت کی۔ انھوں نے حرص و ہوس کی
اندھی تقلید پر احتجاج کیا، اور انھوں نے اس غیر حقیقی ماحول
کے خلاف اعلان جنگ کیا اور اپنے باپ آزر کو اس
بے راہ روی سے باز رہنے کی فہمائش کی، اور قرآن مجید کی
زبان میں ابراہیم علیہ السلام نے صاف صاف کہا:

وَاِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۔ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۔ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۔

جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے جو کہ مشرک تھا، کہا کہ اے میرے باپ تم ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ کچھ سنے اور نہ کچھ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے۔ اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم پہنچا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا۔ تو تم میرے کہنے پر چلو تمکو سیدھا راستہ بتلاؤں گا اے میرے باپ تم شیطان کی پرستش مت کرو بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمانی کرنے والا ہے۔ اے میرے باپ میں اندیشہ کرتا ہوں کہ تم پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے پھر تم (عذاب میں) شیطان کے ساتھی ہو جاؤ۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ صاف گوئی اور ان کا اعلان
حق آزر کی بت ساز طبیعت کو چیلنج نہ کر سکا اور وہ
اس غیر حقیقی ماحول کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کی بات سننے
اور ماننے پر کسی طرح تیار نہ ہوا، اور اس نے صاف صاف
کہہ دیا:

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا

باپ نے جواب دیا کہ تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو، اے ابراہیم اگر تم باز نہ آئے تو میں ضرور تمکو پتھروں سے سنگسار کر دوں گا اور مجھ سے ہمیشہ کیلئے بچے رہو۔ (سورہ مریم)

لیکن ابراہیم علیہ السلام ہر طرح کی دھمکی اور خطرے سے
بے پروا اپنے کام میں مشغول رہے اور فطرت کے اصول کے
سامنے انھوں نے کسی ایسے تصور کو ماننے یا اس کے قبول
کرنے سے قطعاً انکار کر دیا جو انسان کو انسان ہی کے آگے
نہیں بلکہ پتھروں اور بے حس و حرکت مجسموں کے سامنے جبین
نیاز جھکانے پر آمادہ کرے، وہ اس مصنوعی اور بے جان
ماحول میں ایک اجنبی تھے لیکن ان کے ایمان کی طاقت
نے اپنے زمانے کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لی اور پوری
آبادی کے خلاف ان کی آواز اس وقت اٹھی جبکہ ہر طرف سے
خطرات ان کو گھیرے ہوئے تھے، اپنے اور پرائے ان کے
دشمن ہو چکے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام نے ہر خطرہ کو دعوت دی اور ہر
مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوئے۔ آگ کے دہکتے
ہوئے شعلوں میں اپنی جان عزیز کو فنا کر دینے میں انھوں
نے ذرا بھی تامل نہیں کیا جس کا انجام یہ ہوا کہ مخالفین پسپا
ہو گئے، دشمن شکست کھا گئے اور آگ کے دہکتے ہوئے
شعلے گل و گلزار بن کر رہے۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے ایمان
کی وہ لازوال اور غیر فانی طاقت تھی جس کے سامنے دنیا
کی ہر بڑی طاقت شکست خوردہ تھی اور جس نے اپنے زمانے
کے جابر اور صاحب سطوت بادشاہ کے سامنے اس شانِ
بے نیازی کا مظاہرہ کیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں
مفقود ہے۔

اس آزری ماحول کو جنم دینے اور اس غیر حقیقی معاشرہ
کو برپا کرنے میں جس چیز کو سب سے زیادہ دخل تھا وہ اسباب
و وسائل کے پیدا کرنے والے سے قطع نظر کرکے اسباب و
وسائل پر مکمل اعتماد تھا، اسباب ہی معبود و کارساز سمجھے
جانے لگے تھے اور وسائل ہی پر زندگی کی ساری عمارت قائم
تھی، اللہ تعالیٰ نے اس دور کے انسانوں کو متنبہ کرنے کے
لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے اسباب و علل کی
بے بسی کا راز افشا کرنا چاہا اور یہ بتایا کہ وسائل کے بغیر
بھی انسان کس طرح بلند سے بلند مرتبہ پر پہونچ سکتا ہے
اور وہ کس طرح بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے
چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اور زندگی
کے ہر ہر گوشے میں یہ پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ ہر موقع پر
اس کا اظہار ہوتا ہے، خواہ وہ آتش نمرود ہو یا وادی
غیر ذی زرع کے تپتے ہوئے ریگستان ہوں، بے یار و
مددگار بیوی کی بے تابی اور شدت انتظار ہو یا شیر خوار
بچے کی پیاس کی شدت ہو، ظالم و جابر بادشاہوں کی نفرت
حرص ہو یا پوری قوم اور برادری کی شدت عداوت ہو،
آپ جدھر بھی نظر ڈالئے وسائل و اسباب کا فقدان اور
بے یاری و بے بسی، عجز و تہی دستی ہر جگہ نمایاں اور
صاف نظر آئے گی، لیکن اس کے باوجود ہر موڑ پر کامیابی
اور سخت سے سخت آزمائش میں ایک غیبی مدد اس طرح
ساتھ ساتھ دکھائی دے گی کہ اسباب و وسائل کی اس
دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام صرف ایک ماحول یا ایک
قوم اور معاشرہ کے باغی نہیں تھے بلکہ وہ اس زمانے کے

باطل تھے جو اپنا حقیقی راستہ بدل کر وسائل کی راہ پر گامزن تھا، اور اسی کو اپنی معراج اور حقیقی کامیابی کا راستہ سمجھ رہا تھا، انھوں نے آکر اعلان کیا کہ اے اہل زمانہ تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ تمھاری خودی اور تمھارے مرتبے کے کسی طرح شایان شان نہیں ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بت سازی وبت پرستی میں مشغول ہو، تم انسان ہو کر ان مجسموں کے سامنے جھکتے ہو جو تم کو بھی فائدہ نہیں پہونچا سکتے، بلکہ وہ ہر وقت تمھارے ہی محتاج رہتے ہیں۔ ان پر ایک مکھی بیٹھ جائے تو اس کو اڑانے کی بھی طاقت جس معبود کے اندر نہ ہو وہ بلاشبہ باطل وناحق ہے، اور اس سے لو لگانا، اس کے سامنے جبین نیاز جھکانا تمھاری سخت توہین ہے، اور تمھارے منصب پر کلنگ کا ٹیکہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہزاروں سال پہلے جن خود ساختہ معبودوں اور خانہ ساز اصولوں کو توڑا تھا آج دنیا پھر انھیں معبودوں اور انھیں اصولوں کی پیروی کر رہی ہے۔ تاریخ نے گویا اپنے آپ کو دہرایا اور آزر کی صنعت کو آج پھر فروغ حاصل ہوا ہے۔ وسائل واسباب کے سامنے آج عجز وعبادت کا سرخم ہو رہا ہے کارساز حقیقی سے بے تعلق اور فنا ہو جانے والے اسباب پر کامل توکل وبھروسہ، آج کی دنیا کا اصول بن چکا ہے۔

یہ آزری فتنہ جب بھی دنیا میں فروغ پائے گا اور وہ محدود وتنگ ماحول جہاں بھی قائم ہو گا وہی نتیجے اس کے ساتھ آئیں گی، معیار بدل جائے گا۔ ذہنی توازن متغیر ہو جائے گا، گناہوں، لذتوں اور شہوات نفس کو اخلاقی قدروں کا درجہ دے دیا جائے گا، ہر بد اصولی اور فطرت سے بغاوت کو فن اور خدمت کا لباس پہنا دیا جائے گا، اور انسان نہ صرف انسان کے آگے جھکنے لگے گا، بلکہ وہ گناہوں کی عبادت، نفس کی پرستش، رذالت وکمینگی کو فروغ دینے کے لئے اپنے سارے امکانات کو صرف کرنے کی پیہم کوشش میں لگ جائے گا، اور انسانیت دم توڑتی ہوئی نظر آئے گی۔

فتنۂ آزری آج سے ہزارہا سال پہلے پیدا ہوا تھا لیکن آج پھر وہ تازہ دم ہے اور ساری دنیا کو اپنے تیز رو سیلاب کی زد میں لے چکا ہے۔ اگر پہلے ایک آزر تھا تو آج ہزاروں لاکھوں آزر پیدا ہو چکے ہیں۔ آج کے آزروں کی اولاد مارکس واسٹالن، خروشچیف وبلگانن ہیں۔ اگر اس آزر نے سنگسار کرنے کی دھمکی دی تھی تو آج کے آزر لاکھوں ابراہیمیوں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں اور دار کے تختوں پر لٹکا چکے ہیں۔ اس آزر کا طوفان اتنا بلاخیز نہیں تھا جتنا اس کے متبعین اور آج کے آزروں کا ہے۔

پورے ہجری سال میں سب سے زیادہ ابراہیمی یادگاروں کا جو زمانہ ہے وہ یہی ذوالحجہ کا مہینہ ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کی متعدد یادگاروں اور مختلف آزمائشوں کو ہم یاد کرتے ہیں اور اس کی اتباع میں ہم بھی خدا کے حضور اپنی معمولی قربانی پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں، بلاشبہ ہماری قربانیاں، صفا ومروہ کے درمیان ہماری سعی اور اس گھر کا طواف جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا، یہ سب کچھ بہت ضروری اور ان کو انجام دینے والا خوش قسمت اور باعث صد مبارکباد ہے اور ان سے انکار کرنے والا قابل عتاب وملامت بلکہ دائرہ اسلام سے خارج ہے

لیکن اس اعتراف کے باوجود اس کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ محض رسمی طور پر ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی پیروی کر لینا اور ان کی یادگار میں شریک ہو لینا اور سال میں عید الاضحی کے موقع پر ایک جانور کی قربانی دے دینا کافی نہیں، اور نہ اس سے اس طوفان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جس کا مقابلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے میں کیا۔

اس وقت دنیا مادیت کے سامنے اسی طرح سربسجود اور اسباب ووسائل کی پرستش میں اسی طرح مشغول ومنہمک ہے جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھی، بلکہ آج اس مادیت کا دھارا پہلے سے زیادہ تیز ہے۔ پہلے مٹی اور پتھر کے بت پوجے جاتے تھے۔ لیکن آج سونے چاندی کے بت، اور تہذیب وتمدن کے بت، اور قومیت ووطنیت کے مجسموں کی پرستش میں دنیا پوری طرح ڈوبی ہوئی ہے اور مختلف ناموں سے نفس کی پرستش میں لوگ مصروف ہیں کبھی فن اور آرٹ کے نام سے نفس کی پوجا ہو رہی ہے تو کبھی خدمت اور ترقی کے نام سے بت پوجے جا رہے ہیں، اور کہیں علم وادب کا سائن بورڈ لگا کر مادیت کے سیلاب کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ہر چیز کی شکل بدل گئی ہے اور ہر پہلو سے آزری فلسفوں کی خدمت ہو رہی ہے، یہ وہ وقت ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام کے پیروؤں کو بت شکنی کے لئے کمربستہ ہونا چاہیے۔ آج ابراہیم جیسا ایمان، ابراہیم کی سی جرأت وہمت اور ابراہیم جیسا اخلاص چاہیے جو مادیت کے فلسفوں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کا مداوا کر سکے اور اس کو بچا سکے۔

آج اسی بت شکن، بہادر اور مرد مومن جری اور مخلص ابراہیم کی ضرورت ہے جس نے اپنے نفس ایمانی سے آزر کے جادو کو توڑا اور اپنے اخلاص وعمل کے جذبہ سے آزر کے بت کدہ کو ٹھنڈا کیا۔ اس بت کدہ میں آج پھر بہت سے بت جمع ہو گئے ہیں اور ان کو توڑنے کے لئے ایک ابراہیم کی ضرورت ہے۔ لیکن بجز ابراہیم علیہ السلام کے پیروؤں کے اور کون ہو سکتا ہے جو اس مہم کو انجام دے اور ابراہیمی سنت کو پھر سے زندہ کرکے انسانیت کا خراج حاصل کرے،

بقیہ خطبات نبوی

اہل عرب حاکم تھے اور ساری دنیا پر حکمرانی کرنے کا جذبہ رکھتے تھے مگر ہم محکوم ہیں اور چاہتے ہیں کہ ساری دنیا محکوم ہی رہے صرف اس لئے کہ محکومی کی زندگی میں آرام ہے۔ اس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں۔ نہ کچھ بنانے کا فکر نہ کچھ کرنے کی حاجت مگر قدرت کا قانون تو اٹل ہے وہ کہتی اور ببانگ دہل کہتی ہے:

أحسب الناس ان يتركوا ان يقولوا آمنا وهم لا يفتنون.

کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے:

ان الفتیٰ من يقول ها انا ذا
ليس الفتیٰ من يقول كان ابي

(مرد وہ ہے جو کہے میں ایسا ہوں نہ وہ جو یہ کہے میرا باپ ایسا تھا، پدرم سلطان بود)

ہند وپاک کا سب سے پہلا عربی اخبار
الرائد
جو چھ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے
اور علمی مقالات، ثقافتی خبریں
تبصرے، عالم عربی واسلامی کے
مختلف علمی، ثقافتی حالات۔۔
ملک کے عربی داں حلقہ کے سامنے پیش کرتا ہے
صاحب الامتیاز
مولانا محمد رابع صاحب ندوی ادیب اول دار العلوم ندوۃ العلماء
بدل اشتراک: ہند وپاک سے سال بھر کیلئے ۴/۵۰ روپے
غیر ممالک سے ۷/۵۰ "
پتہ:
دفتر الرائد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بیتابیٔ شوق

از سید امین الدین احمد رضوی امروہوی

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

داد از غم مجبوری، اے قلب حزیں لے چل — اے ساز یقیں لے چل، اے سوز یقیں لے چل
اے ذوق نظر لے چل اے شوق جبیں لے چل — اس روضۂ اقدس کے، اس در کے قریں لے چل

اے جذبۂ دل لے چل، اللہ وہیں لے چل

وہ سامنے آنکھوں کے روضہ نظر آتا ہے — فردوس محبت کا نقشہ نظر آتا ہے
آنکھوں سے کچھ اٹھتا سا پردہ نظر آتا ہے — خورشید محبت کا جلوا نظر آتا ہے

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

غرقاب مصیبت کو ساحل نظر آتا ہے — مجنون طریقت کو محمل نظر آتا ہے
اس در سے کہیں جانا مشکل نظر آتا ہے — یہ سر انھیں قدموں کے قابل نظر آتا ہے

اے جذبۂ دل لے چل، اللہ وہیں لے چل

پوچھے کوئی اس دل سے جو کشتۂ فرقت ہے — ناکام تمنا کیوں بیتاب زیارت ہے
وہ بارگہ انوار عشاق کی جنت ہے — تسکین تمنا ہے، تقدیس محبت ہے

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

دنیائے محبت پر رحمت کی گھٹا چھائی — میخانۂ وحدت پر ہیں جمع تماشائی
پھر ساقیٔ طیبہ نے کی انجمن آرائی — بیتاب ہے اس سر میں پھر شوق جبیں سائی

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

گلزار بداماں ہے ہر نخل گلستاں کا — صد مہر درخشاں ہے ہر ذرہ خیاباں کا
ہر گوشہ میں منظر ہے دربار سلیماں کا — واللہ ہے عجب عالم بزم شہ ذی شاں کا

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

اے جذبۂ دل تو ہی اس دل کی نشانی ہے — اس در کے قریں لے چل جو قصر معانی ہے
ہے ایک خلش دل میں جو ان کو دکھانی ہے — اک غم کی کہانی ہے جو ان کو سنانی ہے

اے جذبۂ دل لے چل، اللہ وہیں لے چل

اس درگہ والا پر باچشم تر آیا ہوں — اپنے دل مفتوں کی لے کر خبر آیا ہوں
اک ٹوٹے ہوئے دل کا میں نوحہ گر آیا ہوں — آنکھوں کے بل آیا ہوں خاکم بسر آیا ہوں

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

کہتا ہے کہ آیا ہوں اس در پہ میں فریادی — کہتا ہے کہ لایا ہوں اک محضر بربادی
کہتا ہے کہ قسمت نے کیا کی ستم ایجادی — کہتا ہے کہ اک میں ہوں اور بخت کی ناشادی

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

کہتا ہے امینؔ ان سے دوران جبیں سائی — اے مظہر محبوبی اے شان دل آرائی
کن برسر تا بو تم یک جلوۂ رعنائی — اے در لب لعل تو اعجاز مسیحائی
اے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی — دل بے تو بجاں آمد وقت است کہ باز آئی

اے جذبۂ دل لے چل اللہ وہیں لے چل

غزل

قاضی شکیل عباسی ندوی

جور وستم زمانے کا آخر کہاں نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

پھرتا رہا ہوں اس چمنستاں میں عمر بھر
کل خارزار ہے کہیں گل کا نشاں نہیں

ان کی نظر کا عکس ہے ساری محبتیں
وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

بس دین کی نگاہ سمجھتی ہے اس کا بھید
اس زندگی کا اور کوئی رازداں نہیں

ہو اتباع دیں میں بسر زندگی اگر!
پھر موت وہ بہار ہے جس کی خزاں نہیں

پایا شکیلؔ میں نے مدینے کا آستاں
اب دین کے سوا کوئی جان جہاں نہیں

دوسری قسط

ہاں... نہیں

محمد الحسنی

اور اگر مجھے ذرا اور صاف گوئی کی اجازت دیجئے، تو میں کہوں کہ وہ اسلام جس کو انقلاب مصر کے آغاز اور شاہ کی برطرفی اور جلاوطنی کے وقت اور جہاد فلسطین اور معرکۂ سویز میں "ہاں" کہا گیا اور ملک کی پالیسی بناتے وقت دستور سازی میں اور اپنے انقلاب کے مینی فسٹو میں "نہیں" کہا گیا۔

معاہدۂ پاکستان کے وقت "ہاں" کہا گیا اور دستور سازی اور عائلی قانون منظور کرتے وقت "نہیں" کہا گیا۔

الجزائر کی جنگ کے وقت جس میں دس لاکھ آدمیوں نے قربانی دی "ہاں" کہا گیا اور حکومت بناتے کے بعد ملک کا ڈھانچہ بناتے وقت اور پالیسی طے کرتے وقت "نہیں" کہا گیا۔

وہ اسلام جس کو خانقاہوں، ذکر کے حلقوں، میلاد کی محفلوں، وعظ کے جلسوں اور پرجوش دینی تقریروں (بشرطیکہ حکومت اور ملک کے حالات پر کوئی تنقید نہ ہو) "ہاں" کہا گیا۔

جس کو افطار کی دعوتوں، ریڈیو سے رمضان کے پروگراموں اس کے فضائل پر تقریروں، نعتیہ اشعار اور کلام اقبال میں "ہاں" کہا گیا۔

جس کو "عبدالباسط عبدالصمد" اور مصطفیٰ اسماعیل[1] کی تجوید و قرأت، اسلامی ممالک کے وفود کو قرآن مجید کے ریکارڈ اور مذہبی کتابوں کی پیشکش کے وقت بلکہ جس کو (موسوعۃ عبدالناصر للفقہ)[2] کی ترتیب و تالیف کے وقت ہاں کہا گیا۔ لیکن اس فقہ پر عمل درآمد اور اس قانون کے نفاذ کے موقع پر اور تعلیم و تربیت کے نظام اور ملک کے اجتماعی ڈھانچوں اور سیاسی ڈھانچہ کی تشکیل کے وقت اس کو پوری صفائی کے ساتھ اور بغیر کسی حجاب کے "نہیں" کہا گیا۔

وہ اسلام جس کو لیاقت علی خاں کی اس تقریر میں تو ہاں کہا گیا جس میں انھوں نے کہا کہ "پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہے، ہم اس کے ذریعہ دنیا کے سامنے یہ ثابت کرسکیں گے کہ تیرہ سو برس پہلے کا اسلامی قانون اور اسلامی اصول کتنی صلاحیت اور قیمت رکھتے ہیں" اور دستور سازی کے وقت "نہیں" کہا گیا۔

وہ اسلام جس کو یہ سمجھ کر کہ تاج اور کرسی اس کا نام لے اور اس کا بورڈ لگائے بغیر ہاتھ نہیں آتی "ہاں" کہا گیا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ وہ خواہشات اور انانیت کا دشمن اور عیش و عشرت اور فضول خرچیوں کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہے اور ہماری آزادی و بے قیدی میں رکاوٹ ڈالتا اور پابندی لگاتا ہے اس کو "نہیں" کہا گیا

وہ اسلام جس کو نکاح اور ولیمہ کے مسائل کنویں میں کوئی ناپاک چیز گرجائے تو اس کی پاکی کے مسائل اور حج کے مسائل اور فضائل کے وقت تو "ہاں" کہا گیا اور مرد و زن کے اختلاط کی ممانعت، جسم فروشی، شراب، سود، رقص و نغمہ اور مجسمہ سازی کی حرمت، اسلامی سزاؤں کے نفاذ اور احکام الٰہی کے اجرا کے وقت "نہیں" کہا گیا۔

جس کو ترکی میں الیکشن جیتنے کے لئے "ہاں" کہا گیا عربی میں اذان کی اجازت دی گئی، دینی مدرسے کھولے گئے، مسجدیں مزین کی گئیں، اور ان میں امام مقرر کئے گئے دینی اداروں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور سادہ لوح ترکی اسلام کے شیدائی ترکی قوم کو خوب سبز باغ دکھائے گئے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد "نہیں" کہا گیا۔

وہ اسلام جس کو اسلامی کانفرنسوں اور اسلامی کلوکیم میں ریزولیوشن پاس کرتے وقت اور بجٹ پیش کرتے، اسلامی نمائندوں اور وفود کی پذیرائی اور ان کی خدمت و ضیافت میں سے ممالک اسلامیہ کے طلبہ کے لئے چالیس چالیس عمارتوں کی تعمیر میں ہاں کہا گیا۔ لیکن شرعی حکم اور اسلامی سزا کے اجراء، شخصی و اجتماعی زندگی میں خدا کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی تعمیل میں "نہیں" کہا گیا۔

وہ اسلام جس کو ہماری موجودہ تاریخ میں ایک مرتبہ بہت آہستہ اور بہت پست آواز میں "ہاں" ملا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک سے چوری ختم ہوگئی، صراف روپیوں کے ڈھیر چھوڑ کر نماز کے لئے مسجد چلے گئے اور کسی نے اس کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ شراب نوشی اور سود خواری کے واقعات یا تو ختم ہوگئے یا بہت کم رہ گئے اور دشمنوں نے بھی اعتراف کیا کہ یہ محض دو تین اسلامی سزاؤں کی برکت ہے، جس سے اتنی کم ایسے محیر العقول نتائج ظاہر ہوئے ہیں[1]

وہ اسلام جس کے ایک حکم کی تعمیل کے نتیجہ میں قتل اور خنجر زنی کے واقعات کم ہوگئے۔ پولیس تھانوں میں رپورٹیں جانا بند ہوگئیں۔ زخمی ہونے والوں میں ...... غیر معمولی کمی ہوگئی۔ پولیس کے اس دستہ کو بہت کم زحمت کرنی پڑی اور ان کو دوسرے جرائم کے انسداد کی طرف زیادہ توجہ کرنے کا موقع مل گیا۔[2]

وہ اسلام جس کو "نہیں" کہا گیا تو یہ نتیجہ نکلا کہ رشوت عام ہوگئی۔ لڑکی نے اپنے باپ کو قتل کرنے میں ترحم محسوس نہ کی باپ نے اپنی اولاد کا گلا کاٹنے میں اپنی بیوی کو جانور کی طرح ذبح کرنے میں کوئی تکلف نہ کیا، اغوا، چوری، خودکشی خفیہ و اعلانیہ جسم فروشی اور آخری درجہ کی بداخلاقی اور بے غیری اس قابل بھی نہ رہی کہ اس کا نوٹس لیا جائے اور جماعتوں، قوموں، قبیلوں، برادریوں اور شہروں میں کشمکش برپا ہوئی، حکومت اور عوام ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور جان کے دشمن ہوگئے۔ لوگوں کی عزت و آبرو، جان و مال اور ضمیر و اخلاق کی متاع اور دین و ایمان کی دولت، اعلیٰ انسانی قدریں اور بلند اخلاقی اصول سب اس طرح تباہی کی زد میں آگئے جس طرح کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانہ پر کوئی چیز ہر لحظہ خطرہ میں ہو اور اندیشہ ہو کہ وہ لاوا جو اس "نہیں" کی بدولت برابر پک رہا اور بڑھ رہا ہے کسی وقت اس کو خدانخواستہ اس بری طرح تباہ و برباد کردے کہ نسلوں اور صدیوں تک اس کے برے اثرات جاری رہیں اور پھر اس کی تلافی مشکل ہوجائے۔

یہ اس مظلوم اسلام کی دردانگیز کہانی ہے جو "ہاں" اور "نہیں" کے درمیان ڈول رہا ہے۔ تم نے "نہیں" کا تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ اب ایک مرتبہ "ہاں" کا بھی تجربہ کر کے دیکھو، اور اس سے پہلے اسلام کو کوئی الزام نہ دو!

---

[1] عالم عربی کے وہ صف اول کے قاری جو اپنے زبردست معاوضہ کے باوجود ہر جگہ بلائے جاتے ہیں ان کے لئے جلسے منعقد ہوتے ہیں، لوگ جمع ہو کر سنتے ہیں اور نصیحت حاصل کرنے کے بجائے حسن صوت، اچھے دم اور فن کی داد دیتے ہیں۔

[2] جمال عبدالناصر کے نام پر مصر سے فقہ کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے

[1] سعودی عرب کی طرف اشارہ ہے۔

[2] ایران کے شہر قم سے نکلنے والے ایک سنجیدہ ماہنامہ میں پولیس کی رپورٹ کی روشنی میں کچھ اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے دنوں میں روزہ کی برکت سے جرائم کس قدر کمی ہوئی اور تھانوں کا کام کس قدر ہلکا ہوگیا۔

فلسفۂ عروج و زوال

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر

حبیب الرحمن ندوی

اقوام عالم کی تباہی کی داستانیں آپ نے سنی ہیں شاندار تمدنوں اور بلند بانگ تہذیبوں کا مرثیہ آپ نے پڑھا ہے۔ اس کے اسباب و علل پر بھی غور کیا ہوگا آیئے آج کی فرصت میں ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے قوموں کی تباہی کے اسباب و علل پر ایک بلیغ تقریر سنیں۔ تقریر کوئی لمبی چوڑی نہیں مگر عروج و زوال کے فلسفے پر جس سادہ اور حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے مفکروں ادیبوں اور فلسفیوں کی ساری لن ترانیاں اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہیں۔

اسلام کا ابتدائی عہد ہے چوری کے جرم میں ایک معزز عورت پکڑی جاتی ہے۔ جو اونچے خاندان کی ہے اس لئے لوگ اس پر حد جاری کرنا نہیں چاہتے۔ مگر دربار رسالت میں کون اس کے لئے سفارش کرے یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس لئے کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ بالآخر انتخاب ہوتا ہے اور حضرت اسامہؓ بن زید کو سفارشی بنا کر بھیجا جاتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہؓ کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ مگر جب ان کی زبان سے یہ بات سنتے ہیں کہ چوری کرنے والی عورت کو چھوڑ دیا جائے تو چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ زبان نبوت کی پرجلال آواز حضرت اسامہؓ کے کانوں سے ٹکراتی ہے، "کیا تم مجھے حکم خداوندی میں سفارش کر رہے ہو؟"

حضرت اسامہؓ کانپ جاتے ہیں ہوش بھی نہیں رہتا مجھے کیا کہنا ہے، عرض کرتے ہیں "میرے ماں باپ فدا ہوں میرے لئے مغفرت کی دعا کریں"۔ مگر بات دور سے چلی ہے اس لئے نماز کے بعد ایک خطبہ بھی ارشاد ہوتا ہے:

یا ایھا الناس انما ضل من قبلکم، انھم کانوا اذا سرق الشریف فیھم ترکوہ۔ واذا سرق الضعیف فیھم اقاموا علیہ الحد۔ وایم اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطع محمد یدھا (بخاری، کتاب الحدود)	لوگو: تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقے کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے مگر بڑے لوگوں سے کوئی باز پرس نہ کرتے ـــ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو مجھے اس کا ہاتھ کاٹنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

حاضرین دم بخود ہیں خطبہ کے الفاظ دل کی گہرائیوں تک اتر جاتے ہیں اور بلا تامل چوری کرنے والی عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے ـــ راوی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں، یہ عورت اکثر میرے پاس آیا کرتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ ترحم فرماتے ایک روز اس نے پوچھا یا رسول اللہ میری توبہ قبول ہوئی یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، آج تو ایسی ہے جیسے گناہوں سے پاک اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ خطبہ حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہے۔ اس سے صرف یہی ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ قانون کی نظر میں چھوٹے بڑے یا اپنے پرائے کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ کسی قانون کا مان لینا یا اس کا سمجھ لینا تو آسان ہے مگر اس پر صحیح طریقے سے عمل کرنا دشوار اور اس دشواری کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شریف یا معزز آدمی کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، اس لئے کمزوروں پر قانون کی تلوار چلا کر یہ سمجھ لینا کہ قانون پر عمل ہوگیا ایک مہمل بات ہوگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ قانون چلانے والے خود قانون کا احترام کریں اور اپنے خویش و اقارب کے لئے کوئی امتیاز نہ برتیں کیونکہ اس کے بغیر قانون کی اصل خوبی واضح نہیں ہوسکتی۔ افسوس آج کی دنیا کا سب سے بڑا روگ یہی ہے کہ جزا و سزا کے قانون میں رنگ و نسل اور قوم و مذہب کا امتیاز برتا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھے سے اچھے قانون کا اثر زائل ہو کر رہ گیا ہے۔

خطبے کے ان اشارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجرموں کے لئے سفارش ایک مذموم چیز ہے خصوصاً جرم جب عیاں ہو اور پایۂ ثبوت تک پہونچ جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ سفارش کوئی مذموم چیز ہے بلکہ صرف یہ کہ سفارش کے ذریعہ عیب کو چھپایا نہیں جاسکتا، سفارش کے ذریعے عیب کو ہنر بنانے کا فن تو صرف دور حاضر کی پیداوار ہے اور اب تو خود سفارش نے اپنا رنگ و روپ بدل دیا ہے اور ہر رنگ میں اس کی شناخت کرلینا کوئی آسان کام نہیں، ارباب اقتدار سے لیکر ہماری نجی زندگی تک اس کا خیال پھیلا ہوا ہے۔ افسوس ہم نجی زندگی میں بھی اسی شخص کو مجرم قرار دیتے ہیں جس سے ہمارا کوئی تعلق اور واسطہ نہ ہو۔ تعلقات اور رشتے کی بنا پر نہ صرف بڑے بڑے عیوب اور جرائم نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں بلکہ طرح طرح سے ان کی تاویل بھی کی جاتی ہے۔ بہرکیف کسی نظام کے قانون میں امتیاز اور استثناء اس نظام کی بنیاد کو کھوکھلی کردیتا ہے اور اسی امتیاز و استثناء کے پردے میں برائیاں جنم لیتی ہیں، اخلاقی قدریں تباہ ہوجاتی ہیں۔ انسان میں اس کے ذریعہ غلط کاری کا رجحان پیدا [illegible] ہوتا پرورش پاتا پروان چڑھتا اور برابر ترقی کرتا [illegible] جس کی وجہ سے پوری سوسائٹی کا متاثر ہونا یقینی ہے [illegible] دیکھنے میں یوں ہر استثنائی حالت مہیب نظر نہیں آ[illegible] لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار بھی نہیں ہوسکتا [illegible] کی کوکھ سے تباہی و بربادی کا سارا سیلاب ابھرتا بڑھ[illegible] اور سارے عالم کو اپنے رو میں بہا لیجاتا ہے۔ اسی لئے حضو[illegible] اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک لمحے کے لئے اس چیز کو گوا[illegible] کرنا برداشت نہیں کرتے۔ آپ کے خطبے سے اور بھی [illegible] سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر یہاں تفصیل سے قطع [illegible] ہم صرف یہ بتادینا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف [illegible] عبادات اور وظائف کے طریقوں اور اصولوں ہی کا نام [illegible] وہ حکمرانی اور جہانبانی کا بھی ایک مکمل دستور ہے جس [illegible] خوبیاں اسی وقت ظاہر ہوسکتی ہیں جب ہم آگے بڑ[illegible] اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ قرون اولیٰ کے مسلما[illegible] آج تک صرف اس لئے زندہ ہیں کہ انھوں نے جس با[illegible] کو حق سمجھا اس پر عمل بھی کیا۔ ہم زندہ ہیں مگر ہماری زند[illegible] مردوں سے بدتر اس لئے ہے کہ ہم میں ہمت و اولوالعز[illegible] جیسے اوصاف نہیں، دنیا اور دنیا کے کاموں کو حقیر سمجھ[illegible] تاکہ کچھ نہ کرنا پڑے۔ توکل اور تقدیر کو بھی ہم نے تن آسا[illegible] اور اوہام پرستی کا بہانا بنایا اور اپنی اصل مذہبی زندگی [illegible] کوئی ایسا عملی نمونہ ہم نے پیش نہیں کیا جسے دیکھ کر دنیا [illegible] اسلام کی طرف جھکنے کی خواہش ہو (بقیہ ص پر)

انٹرویو

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو

یونس نگرامی ندوی

پنجاب میل اپنی پوری تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے چند حضرات ریڈرز ڈائجسٹ کا سالنامہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ آم کے پیڑوں پر بور آچکے تھے کھیتوں میں گیہوں کی سنہری بالیاں جھوم رہی تھیں۔ کہیں دور سے آتی ہوئی کوئل کی خوبصورت دھیمی کوک میرے کان کے پردوں سے ٹکرا گئی۔ لیکن مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس آواز کے پیچھے صدیوں پرانا درد و غم چھپا ہوا ہے۔ ایک ایسا غم کہ جس کا غم گسار کوئی نہ ہو۔ ساز کے ان تاروں کی طرح کہ جن سے نکلی ہوئی دھنیں تو سب کو پسند ہیں لیکن خود ان تاروں پر کیا بیت جاتی ہے۔ اس کا کسی کو پتہ بھی نہیں۔ میں انھیں خیالات میں غرق تھا کہ اچانک ٹرین اس اسٹیشن کو پار کر گئی۔ جہاں سے میرا قصبہ و میرا وطن صرف چند میل کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے۔ دل میں ایک ہلکی سی کسک پیدا ہوئی، بے شمار یادیں ہجوم کرنے لگیں۔ ایسی یادوں کا ہجوم کہ جن کے بیچ کسی خوشی کا پتہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ یادیں ان لوگوں سے وابستہ تھیں جن پر موت کا پردہ پڑ چکا تھا۔ اٹھتی ہوئی جوانیاں کھلتے ہوئے پھول سب مرجھا چکے تھے اب صرف چاروں طرف ایک بے پناہ مہیب سناٹے کی حکمرانی تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ اے اللہ تیری مصلحتوں سے ہم نا آشنا ہیں۔ تو جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن ہم لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ تیرے امتحان پر پورے اتر سکیں۔ بس اب ضرورت ہے تو صرف تیری رحمت کی۔ میں نے گھڑی دیکھی شام کے چار بج رہے تھے۔ رائے بریلی کا اسٹیشن اب آنے ہی والا تھا۔ ہینڈ بیگ میں اپنا سامان رکھ رہا تھا کہ میں نے سنا، ایک صاحب اپنے ہم سفر ساتھی سے کہہ رہے تھے یہ رائے بریلی ہے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک یہیں سے اٹھی تھی۔ یہ بڑا تاریخی مقام ہے۔ میں نے سوچا یہ اہل عزیمت اور اللہ والے اس دنیا سے تو چلے جاتے ہیں لیکن ان کی یاد اور ان کا خیال لوگوں کے دلوں کو گرمائے رکھتا ہے۔

اس مرتبہ رائے بریلی میرے آنے کا مقصد علی میاں صاحب سے انٹرویو لینا تھا۔ ناظرین معاف فرمائیں کہ اس وقت میں نے صرف (علی میاں) لکھا ہے مولانا یا علامہ وغیرہ کے القاب جان بوجھ کر نہیں استعمال کئے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھ کو اس چھوٹے سے لفظ (علی میاں) میں جتنی اپنائیت اور محبت معلوم ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں اور الفاظ کو تہی دامن سمجھتا ہوں۔ یا دوسرے الفاظ استعمال کر کے میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاید ان جذبات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکا جو علی میاں کے بارے میں میرے دل میں موجزن ہیں۔ جس زمانے میں ندوہ میں میں زیر تعلیم تھا۔ کبھی کبھی پابندی سے علی میاں کی مجلس میں جو بعد نماز عصر مہمان خانہ کے صحن میں ہوتی تھی حاضری نہیں دے سکا۔ ہاں کبھی کبھار ضرور چلا جاتا تھا۔ لیکن ان کی محبت اور سب سے بڑھ کر ان کی کتابوں سے عقیدت ہر حال میں رہی ادھر کوئی کتاب چھپی جب تک پوری ختم نہ کر لی دم نہ لیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجلس میں حاضر تو نہیں ہوتا تھا لیکن اس خاندان کی علمی و اصلاحی عظمت اور ڈاکٹر صاحب[1] مرحوم کا تذکرہ اور علی میاں صاحب کی بے نفسی اور اخلاص کی دولت کے تذکرے ہر روز ہی گھر میں جاری رہتے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا تذکرہ آیا نہیں کہ والد صاحب[2] کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کے علاوہ یہ محبت کے رشتے یوں بھی اور مضبوط ہیں کہ میرے دادا مرحوم شاگرد ہیں حکیم سید عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ کے اور یہ خادمی و مخدومی کا سلسلہ بھی اب تک ویسے ہی جاری ہے۔ بات دور نکل گئی۔ تذکرہ چل رہا تھا میری اس نالائقی کا میں مولانا کی مجلس میں پابندی سے حاضر نہیں ہوتا تھا۔

جس زمانہ میں میں مدینہ یونیورسٹی میں تھا۔ علی میاں صاحب بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر کے تشریف لائے اور تقریباً دو ماہ قیام رہا۔ اس دو ماہ کے عرصہ میں دن و رات میں مولانا کے ساتھ رہا۔ اور وہ سارا ظاہری بعد جو اتنی کا تھا سب ختم ہو گیا۔ ایک رات میں اور مولانا مسجد نبوی میں بیٹھے تھے۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی میں نے سوچا کہ اس نشست کو کسی یادگاری صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ فوراً ہی اٹھا اور ایک نسخہ سیرت ابن ہشام کا خرید لیا۔ اور مولانا سے عرض کیا کہ اس پر اپنے ہاتھوں سے کچھ تحریر فرما دیں۔ مولانا نے میری اس درخواست کو قبول فرما لیا اور یہ عبارت تحریر فرمائی:

> وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
> غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
> اقبال

> تعلم ابوالحسن علی
> مدینہ منورہ مسجد نبوی ۱۰۔ ذی قعدہ ۹۳ھ
> درمیان اذان و فرض عشاء

کتاب و مقام کی مناسبت سے یہ شعر کتنا برمحل ہے اور اس وقت جو کیفیت و لطف محسوس ہوا تھا اس کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ جیسے کل کی بات ہو جس وقت تکیہ (رائے بریلی) پہونچا سب خیالات تازہ ہو چکے تھے عصر کا وقت قریب تھا۔ میں نے اپنی آمد کی اطلاع بھیجی تھوڑی دیر میں مولانا تشریف لائے مجھ کو دیکھ کر جس خوشی اور محبت کا اظہار فرمایا۔ وہ میری حیثیت سے کہیں بڑھ کر تھا۔ میں نے عرض کیا کہ لکھنؤ میں آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ انٹرویو کے لئے تھوڑا سا وقت عنایت فرمائیں گے۔ مولانا نے فرمایا ہاں! ہاں مجھ کو خیال ہے۔ انٹرویو ضرور دوں گا۔ لیکن بعد نماز مغرب۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔ ....

... آم کے بور کی خوشبو اس وقت کچھ اور بڑھ گئی تھی دریا کی سمت سے آتی ہوئی نرم نرم ٹھنڈی ہوائیں اس خوشبو کو اڑائے پھر رہی تھیں۔ اس کیف آگیں منظر و موسم نے عجیب لطف پیدا کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی۔ نماز ادا کی گئی اور اس کے بعد ایک کمرہ میں میں مولانا سے مصروف گفتگو تھا۔

س: ابتدائی زندگی میں کیا عوامل کار فرما تھے اور گھریلو ماحول کس انداز کا تھا۔

مولانا نے فرمایا کہ میری عمر صرف نو سال کی تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ پورے خاندان میں انگریزی تعلیم رائج تھی اور معاشرتی طور پر بھی سب انگریزی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے۔ گھروں میں زمینداری تھی۔ اپنے پورے کنبے کے ساتھ صرف میرے گھرانے میں معمولی زمینداری تھی میری ساری تربیت و تعلیم ڈاکٹر عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ نے دی۔ لیکن ایک بات ضرور تھی جو پورے خاندان میں موجود تھی وہ تھی شرک و بدعت سے اجتناب و پرہیز اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اثر حضرت سید احمد شہیدؒ کا ہے ساتھ ہی ساتھ عورتوں میں دینداری کا رجحان بہت تھا اور یہ رجحان ان خواتین میں مردوں سے زیادہ ہی تھا جس کا اثر تھا کہ بچوں کی تربیت میں اور تعلیم میں شرک و بدعت کے سائے پڑنے نہیں پاتے تھے اور وہ ہر طرح کی شرک اور اس کے اقسام سے محفوظ رہتے تھے۔ صرف میرا گھرانہ اس دور میں عربی تعلیم میں مشغول تھا اور اسی میں اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب کچھ اور میں بڑا ہوا تو ندوہ میں تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ مولانا یہ فرما کر خاموش ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ ندوہ میں تعلیم کے زمانے میں کن اساتذہ کا سب سے زیادہ اثر تھا اور وہ کن صفات کے حامل تھے۔ میرے اس سوال نے شاید ان اساتذہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اسی لئے مولانا کچھ دیر تو خاموش رہے۔ پھر غم آلود آواز میں فرمایا:

میری طالب علمی کے زمانہ میں جن اساتذہ کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر رہا ہے ان میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم اور مولانا شبلی فقیہ کا نام سر فہرست ہے۔ ان حضرات کے اخلاص اور سادگی اور علمی ذوق کی وجہ سے میں بہت متاثر تھا اور پھر سب سے بڑھ کر ان لوگوں کا انداز تربیت بہت خوب تھا۔ مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے تو میں بہت ہی مانوس تھا اور تقریباً انھیں کے ساتھ رہتا بھی تھا اور ان کے روپے پیسے وغیرہ سب کا حساب بھی میرے ہی پاس رہتا تھا۔ ان کے اندر سادگی اس قدر تھی کہ اگر ہم لوگ بازار کسی ضرورت سے جاتے ہوتے تو خود بھی ساتھ ہو جاتے اور فرماتے ہم بھی ساتھ چلتے ہیں تاکہ تم لوگوں کو سامان گراں نہ ملے۔ مولانا نے فرمایا کہ یونس! تم اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ ان کے اندر کس قدر ہمدردی اور غم گساری اور شاگردوں کے ساتھ محبت آمیز برتاؤ کرنے کا جذبہ تھا۔

اب میرا اگلا سوال تھا کہ: اسلامی کردار کی تعمیر میں کن شخصیات نے اثر ڈالا:

مولانا نے فرمایا کہ میرے اسلامی ذہن و کردار کی تعمیر میں مولانا خلیل عرب صاحب اور مولانا احمد علی اور مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں حضرات کی توجہ اور عنایات سے میرے اندر یہ جذبات پیدا ہوئے۔

اس سوال کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ لگے ہاتھ یہ بھی پوچھ لوں کہ دینی دعوت کی طرف رجحان کے اسباب کیا تھے؟

مولانا نے فرمایا کہ پہلے پہل تو میری طبیعت اس کام کی طرف بالکل راغب نہیں تھی بلکہ ایک گونہ شرح صدر بھی نہ تھا۔ لیکن بھائی صاحب[1] مرحوم کو اس کام سے بہت لگاؤ تھا خصوصاً ان کو مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں میں اسلام کی تبلیغ کی بڑی خواہش تھی اور وہ مجھ کو برابر اس کام کی طرف مختلف انداز سے آمادہ کیا کرتے تھے۔ بہرحال کچھ تو بھائی صاحب کا اثر اور پھر مولانا الیاس صاحبؒ کے تعلق سے اس کام کی طرف رغبت ہوئی اور دل بھی پوری طرح آمادہ ہو گیا۔

مولانا یہ فرمائیے کہ جس زمانے میں آپ ندوہ میں تفسیر قرآن کا درس دیا کرتے تھے تو آپ کا عمومی تاثر قرآن مجید کے متعلق کیا تھا اور دوران تدریس کن کتابوں سے زیادہ مدد ملتی تھی۔

مولانا نے فرمایا جس زمانہ میں تفسیر قرآن کی خدمت میرے سپرد تھی تو قرآن مجید کے متعلق جو میرا تاثر تھا وہ تھی اس کی دعوتی اسپرٹ اور رنگ چنانچہ میں بھی اس کو اسی انداز میں بیان کیا کرتا تھا۔ پھر جب مرکز میں بھی درس قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا تو یہ دعوتی رنگ اس درس میں جاری ہو گیا اور یہاں ندوہ میں تدریسی رنگ غالب آگیا اور رہا تمہارا یہ سوال کہ کن کتابوں سے مدد ملتی رہی تو اس سلسلہ میں تقریباً متقدمین و متاخرین سب ہی کی تفسیریں زیر مطالعہ رہیں اور المنار اور ترجمان القرآن سے بھی کافی مدد ملتی رہی

ابھی یہ گفتگو ختم ہی ہوئی تھی کہ کھانا لگ چکا تھا، مولانا نے فرمایا پہلے کھانا کھا لو پھر اس انٹرویو کو پورا کر لینا تقریباً بیس منٹ تک یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اور اب میرا خیال تھا کہ عشاء کی نماز کا وقت بھی قریب آگیا تھا اس لئے کھانے کے فوراً ہی بعد میں نے دریافت کیا کہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کس حیثیت سے متاثر ہیں: اور ان کو آپ کے نزدیک کس فن سے زیادہ لگاؤ تھا۔

مولانا نے فرمایا کہ میں سید صاحب مرحوم سے ان کے علمی ذوق و تحقیق اور کثرت مطالعہ سے بے حد متاثر رہا اور میرے نزدیک ان کو حقیقی لگاؤ قرآن مجید سے تھا اور میری اس رائے کے موافق مولانا اویس صاحب بھی ہیں اور دوسرا فن ہے علم الکلام کا اس سے بھی سید صاحبؒ کو کافی لگاؤ تھا۔ مولانا خاموش ہوئے تو میں نے عرض کیا

مولانا موجودہ دور کے مستشرقین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور کیا ایک عام مسلمان ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کر سکتا ہے:

دیکھو ان لوگوں کے سلسلے میں جو کچھ کہنا ہے وہ سب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں لکھ چکا ہوں۔ بہرحال پھر بھی ان کی کتابیں مبتدی و متوسط حضرات کے لئے مضر ہیں اور منتہی حضرات کے لئے ان کا مطالعہ اتنا مضر نہیں ہے بلکہ کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے چونکہ وقت کم تھا اس لئے سوالات کو سمیٹتے ہوئے میں نے عرض کیا۔

مولانا یہ فرمائیے کہ حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ سے کس طرح عقیدت پیدا ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے

یہ سنہ ... کا آخر تھا کہ میں اور مولانا منظور صاحب نعمانی نے رائے پور کا سفر کیا۔ وہاں جو کچھ میں نے دیکھا اس سے طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ خصوصاً حضرت شیخ کا انداز تربیت اور اخلاص نے بہت متاثر کیا۔ پھر اس کے بعد برابر حاضری ہوتی رہی اور تعلقات میں اضافہ ہوتا ہی رہا

میں نے عرض کیا مولانا عشاء کا وقت قریب صرف چند سوالات اور رہ گئے ہیں اگر اجازت ہوں تو عرض کروں مولانا کی رضامندی پاتے ہی میرا یہ سوال تھا کہ

موجودہ دور میں بظاہر روحانیت مادیت کے سامنے شکست کھا رہی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کی کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟

مولانا نے فرمایا بھائی یہ سوال تو بہت تفصیل طلب ہے اور اس کے لئے تو پوری ایک کتاب چاہئے ... جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو تو (مشرقیت و مغربیت کی کشمکش) میں کچھ مواد مل جائے گا۔

مولانا اپنے معاصر علماء میں علمی تحقیق اور ذوق ... کے اعتبار سے آپ کن حضرات سے متاثر ہیں۔

علمی تحقیق اور ذوق مطالعہ کے اعتبار سے میں ... سلیمان ندوی اور مولانا شاہ حلیم عطار صاحب اور ... مناظر احسن صاحب گیلانی سے متاثر ہوں۔

مولانا یہ فرمائیے مشرق وسطی میں اسلام کے ... کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور کیا اسلام کی نشاۃ ... پھر سے ممکن ہے

(بقیہ ص ۱۲ پر)

[1] ڈاکٹر عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ
[2] مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی

[1] ڈاکٹر عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تبت پر چین

کے حملہ کی داستان

ابوبکر تقی ندوی

نا مناسب نہ ہوگا اگر اس تکلیف دہ داستان سے قبل تبت کے حدود اربعہ اس کی خصوصیات و اہمیت پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ تبت اور تبتیوں کے مصائب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے!

حدود اربعہ ہندوستان اور چین کے درمیان ایک وسیع قطعہ زمین ہے جو کہ عرف عام میں تبت کے نام سے یاد کی جاتی ہے، ایشیا میں جغرافیائی حیثیت سے تبت کا وہی مقام ہے جو براعظم یورپ کے ملک سوئٹزرلینڈ کا، یہ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ بلند ہے، اور ایشیا کے بلند ترین پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا نہایت خشک و سرد ہے اس کے رقبہ کا اندازہ چار لاکھ ترسٹھ ہزار دو سو مربع میل میں لگایا گیا ہے۔ لیکن اکثر علاقہ برف باری اور سردی کے باعث رہائش کے لائق نہیں اس لئے آبادی نسبتاً بہت کم ہے۔ بلکہ رقبہ کو دیکھتے ہوئے نہ ہونے کے برابر ہے۔ شمال میں کوئی لن کوہستان کا طویل سلسلہ ہے جو تبت کو مشرقی ترکستان سے جدا کرتا ہے۔ مشرق کی طرف سلطنت چین ہے اور جنوب میں ہمالہ کی فلک بوس دیوار ہے جو ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ جس کی پہاڑیاں ۱۹ ہزار سے ۲۲ ہزار فٹ تک بلند ہیں اس کے مغرب میں لداخ اور کشمیر ہے۔

تبت میں آبادی کا علاقہ صرف کوہستان تنگلا کے جنوب میں ہے۔ کیونکہ یہاں آب و ہوا نسبتاً سختی کم ہے جو قابل برداشت ہے، اسی حصہ میں بڑے بڑے دریاؤں کے منبع اور ان کی بالائی وادیاں ہیں اس حیثیت سے تبت کا یہ علاقہ قطعہ بہشت معلوم ہوتا ہے۔

چینی قبضہ سے قبل تبت ایک غیر متمدن علاقہ تھا جس میں ہر مذہب کو پوری آزادی تھی۔ وہاں کے سربراہ لاما کہلاتے تھے جو بدھ مذہب کے ماننے والے تھے ان کے معتقدین اپنے رہنما کے ایک ادنیٰ اشارے پر اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے،

چونکہ چین ہی ایک ایسا ملک ہے جو تبت سے ملا ہوا ہے اس لئے نظم و ضبط نہ ہونے کی وجہ سے اور بعض معاہدوں کی وجہ سے چینیوں کو اندرون تبت آنے میں کسی قسم کی پریشانی در کاوٹ نہ ہوتی اور وہ برابر تبت آتے جاتے رہتے لیکن ان کی نیتوں میں کھوٹ ہوتا، وہ ہمیشہ تبت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور اس پر اپنا قبضہ جمانے کی ترکیبیں سوچا کرتے۔ بھولے بھالے تبتی عوام ان چیزوں سے غافل چینیوں کے جال میں پھنستے چلے گئے اور بیدار اس وقت ہوئے جب ملک ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس لئے مجبوراً انھیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔

اس کی داستان اس طرح شروع ہوتی ہے:

۱۹۱۱ء میں تبت اور پرانے چین (کومن تانگ) میں بعض وجوہ کی بنا پر سخت معرکہ آرائی ہوئی اور اس میں دونوں طرف کے بہت سے لوگ کام آئے۔ لیکن تبت کو اپنی کمزوری کی بنا پر پسپا ہونا پڑا اور اس پر کومن تانگ کی بالادستی تسلیم کر لی گئی اور اس بالادستی سے چینیوں نے بہت فائدے اٹھائے۔ ان کی ایک بڑی تعداد نے تبت میں سکونت اختیار کر لی اور لہاسہ جو کہ تبت کا دارالسلطنت ہے وہاں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا اور ملکی نظم و نسق پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ تبت نے اس خطرے کو محسوس کیا اور چین کے خلاف ایک مرتبہ پھر اعلان جنگ کر دیا، اس مرتبہ تبتیوں کو کامیابی نصیب ہوئی اور انھوں نے چینیوں کی ایک بڑی تعداد کو ملک بدر کر دیا۔ بہتوں کو قتل کیا، اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے اور اس کے بعد تبت نے چین و اطمینان کی سانس لی۔

لیکن شاید تبتیوں کی قسمت میں اطمینان و سکون نہیں لکھا تھا۔ کیونکہ اس کے چند ماہ بعد چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ دنوں تک تو وہ اپنے اندرون ملک کے معاملات کو ٹھیک کرنے میں لگے رہے، جب ملک کا نظم و نسق ٹھیک ہو گیا تو انھوں نے بغیر کسی اشتعال کے اور بغیر کسی اطلاع و اعلان کے تبت پر چڑھائی کر دی تبت اس اچانک حملہ سے گھبرا گیا اور اس کی قومی اسمبلی نے اقوام متحدہ سے مدد اور مداخلت کی اپیل کی، لیکن اقوام متحدہ سے یہ جواب ملا کہ دونوں ہمسایہ ملک دوستانہ فضا میں اپنے معاملات طے کریں، چنانچہ ۱۹۵۱ء اکیوان میں تبت اور چین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ تبت کے خارجی معاملات حکومت چین کے اختیار میں رہیں گے، داخلی طور پر تبت آزاد ہوگا، دلائی لاما کے تمام اختیارات حسب دستور سابق برقرار رہیں گے چین مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے گا۔

چین نے کرنے کو تو تبت سے یہ معاہدہ کر لیا لیکن اس نے ایک دوسری ترکیب سوچی وہ یہ کہ تبت کے باشندوں کے دماغ کی دھلائی کر دی جائے۔ ان کے نوخیز طبقوں کو کمیونزم کی طرف مائل کیا جائے۔ اس طرح ملک بھی اپنے قبضہ میں آ جائے گا اور بدنامی بھی نہ ہوگی، اگر درمیان میں کوئی مخالفت ہوئی تو اسے کچل دیا جائے گا۔

اس لئے چین نے ابتداً تبتی عوام کو یہ باور کرایا کہ وہ ان کے قومی ترقیاتی منصوبوں میں مدد کرنا چاہتا ہے تبتی اس کے لئے راضی ہو گئے اور چین نے ماہرین فنون کی صورت میں اپنے فرستادوں کی ایک فوج تبت میں اتار دی، جس نے عوام کے ذہنوں کو بدلنے کا کام شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس نے ایسے مدارس کھولے جس میں پڑھنے والے بچوں کی سرپرستوں کی مالی امداد کی جاتی، غریب اور ناواقف عوام چینیوں کے اس چال کو سمجھ نہ سکے کہ یہ مدارس دراصل کمیونزم کی اشاعت کے مرکز ہیں، اس لئے انھوں نے اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنا شروع کر دیا۔ اس میں تبت کے مسلمان بھی پیش پیش تھے۔ چند دنوں ہی میں ان مدارس میں تبتی بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی جہاں ان کو کمیونزم کی تعلیم دی جاتی ان کے آباؤ اجداد کے نظام کو فرسودہ قرار دیا جاتا اور کمیونزم کی خوبیاں اور اچھائیاں ان پر واضح کی جاتیں۔

شروع میں چینیوں نے ہر مذہب کی رعایت کی مسلمان بچوں کو نماز کی چھٹی دیتے اور دوسرے مذاہب کے بچوں کو ان کے مذہبی رسوم ادا کرنے کے وقت چھٹی دے دیتے لیکن پھر آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے نظم میں تبدیلیاں شروع کیں اور کام کے وہی اوقات مقرر کئے جو عبادت کا وقات تھے، بچے چونکہ کمیونزم کو اخذ کر رہے تھے اس لئے ان کو اس کا احساس بھی نہیں، لیکن تبتی عوام اس راز سے واقف ہو گئے اور باہم صلاح و مشورہ شروع ہوا، تبتیوں نے اپنے بچوں کو اسکول جانے سے منع کر دیا۔ (بقیہ ص ۱۵ پر)

ناشناسانِ ادب سے!

ابوالاسرار رمزی اٹاوی

(۱)

فسانہ تا بکے دہرائے گا جذبات عریاں کا

پرستار تغزل اے گناہ عشق کے بندے
دماغ و دل ترے گندے ترے افکار بھی گندے
ٹپکتی ہے شراب معصیت وحشی خیالوں سے
اذیت روح کو ہوتی ہے تیرے خوش جمالوں سے

تو سودائی رہے گا تا بکے رخسار جاناں کا

(۲)

جنوں کب تک تجھے ظالم جنون فتنہ ساماں کا

ترا دل فطرتاً نور ہدایت کا نہیں حامل
میں تیرے لغو محسوسات کا ہرگز نہیں قائل
تو اک فردوس رنگیں تھا رہا لیکن تو ناکارہ
مجسم ہے خرابی تو تیرا دل سرخ انگارہ

دھواں کب تک اڑائے گا فغان شعلہ افشاں کا

(۳)

کبھی تو نے لکھا ہے مرثیہ قوم پریشاں کا

کبھی مصلح کی صورت تم نے امت کو جگایا ہے
کبھی اشعار کے نشتر سے پہلو گدگدایا ہے
اشاعت فلسفہ کی اور سائنس و سیاست کی
کبھی تبلیغ کی ہے شاعری سے دین و ملت کی

جہاں والوں کو پہنچایا کبھی پیغام یزداں کا

(۴)

کبھی پیغمبرانہ نطق سے روحوں کو گرمایا

تصوف، معرفت، حکمت کی دیکھی روشنی تو نے
کبھی اقبال ہندی کی پڑھی ہے مثنوی تو نے
کبھی تو نے چنے ہیں پھول سعدی کے گلستاں سے
کبھی ساغر پئے حافظ کے عرفانی خمستاں سے

کبھی معجز اثر پیغام سے دنیا کو تڑپایا

(۵)

کبھی دامن چھوا ہے تو نے اپنی حد امکاں کا

کبھی شعلے کو تو نے وزن کے کانٹے میں تولا ہے
کلید فکر سے باب حقیقت کو بھی کھولا ہے
کبھی صرف عبادت بھی کیا لمحات فرصت کو
پڑھا ہے غور سے تو نے کبھی قرآن فطرت کو

کبھی پردہ اٹھایا ہے حریم شبستاں کا

(۶)

قضا گیری، تنوع اور جدت کی ضرورت ہے

جنھیں قدرت سے غافل شاعری انعام ہوتی ہے
دماغ و دل پہ ان کے بارش الہام ہوتی ہے
وہ "سر" جان تدبر، مخزن افکار ہوتے ہیں
وہ "دل" اسرار فطرت کے امانت دار ہوتے ہیں

تری بے مائگی سے شعر مرہون خجالت ہے

وجودت بر لباس شاعری یک داغ رسوائی
چگونہ شاعرت گوئم زغائت ناشناسائی

ہندوستان پر

نادر شاہ

کے حملہ کی دلچسپ داستان

محمد حسان علوی بی۔ اے آنرز ایم اے

نادر شاہ اور ہندوستانی فوج میں مقابلہ

۱۲ فروری

شہر کرنال مغل دارالسلطنت دہلی سے ۷۵ میل شمال میں تھا اور پانی پت سے ۲۰ میل شمال اور تراوڑی سے ۹ میل جنوب میں تھا، جہاں بہت سی فیصلہ کن جنگیں اب تک لڑی جا چکی تھیں، اور اب ایرانی اور ہندوستانی فوجیں بھی اسی تاریخی مقام پر فیصلہ کن جنگ کے لئے تیاریاں کر رہی تھیں۔

نہر علی مردان خاں شہر کے مشرقی سمت پر واقع تھی اس نہر اور دریائے جمنا کے مشرق کی طرف تقریباً سات میل لمبائی اور چوڑائی میں میدان پڑا ہوا تھا۔ جو اس زبردست جنگ کے لئے نہایت موزوں تھا۔ محمد شاہ نے اس نہر کے مغربی کنارے پر اپنے کیمپ خندقیں بنا کر خوب اچھی طرح سے محفوظ کر لئے تھے اور اس کے جنوب میں شہر کرنال دیواروں سے گھرا ہوا تھا، حملہ آوروں کی آخری سرائے عظیم آباد کرنال کے شمال سے صرف بارہ میل دور رہ گئی تھی۔ اور شہر کے مغربی سمت سے صرف ۱۰ میل کا فاصلہ رہ گیا تھا، اور باقی ۸ میل کا فاصلہ زبردست جنگل سے گھرا ہوا تھا جس میں سے ایک بہت ہی تنگ راستہ آمد و رفت کے لئے چھوٹ گیا تھا کرنال کا شمالی حصہ ۴ میل تک جنگلات سے بالکل پاک صاف تھا، محمد شاہ کی مقدمۃ الجیش اور میمنہ اس طریقے سے قدرتی طور پر جنگلات اور نہر کی وجہ سے محفوظ تھے ہندوستانی فوج کی تقسیم و ترتیب اس طرح تھی کہ نظام ہراول فوج کے ساتھ تھا۔ جس کے دونوں طرف توپیں لگی ہوئی تھیں، وزیر مغربی حصہ کی طرف تھا، شہنشاہ مرکز کو سنبھالے ہوئے تھا، اور خان دوراں مشرقی حصہ کی کمان کر رہا تھا۔

نادر شاہ بروز اتوار ۱۱ فروری ۱۷۳۹ء کو علی الصباح سرائے عظیم آباد پہونچ گیا تھا، حاجی خان کی قیادت میں ۶ ہزار گھوڑ سوار (جو کردستان کے بہترین سپاہی تھے) دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اور نہر کے راستوں پر شاہی کیمپ تک خوب دیکھ بھال کی اور دشمن لائن سے باہر کے گرفتار شدہ قیدیوں کو اس نے نادر شاہ کے سامنے پیش کیا۔

شاہی افواج کی بالکل صحیح تقسیم و ترتیب سے باخبر ہو کر اور وہاں کے راستوں سے مطلع ہو کر نادر شاہ نے منہ در منہ حملہ سے بچتے ہوئے کرنال کے مشرقی حصہ کی طرف دورہ کیا اور خیمہ زن ہونے کے متعلق سوچنے لگا تاکہ جمنا کے کنارے رہتے ہوئے اس کے پانی سے مستفید ہو سکے اور پانی پت پر قبضہ کر کے دہلی سے شہنشاہ کے سارے ذرائع ختم کر دے اور وہاں سے کمک کے سارے راستے مسدود کر دے، اس قسم کی لشکر کشی سے نادر شاہ، محمد شاہ کو مغل حد سے باہر نکال کر لانا چاہتا تھا اور انتخاب کردہ میدان میں جنگ کرنا چاہتا تھا۔ یا ان کو کرنال میں چاروں طرف سے گھیرنا چاہتا تھا کہ وہ بغیر جنگ کے دہلی کی طرف پیش قدمی کر دے، اس کا پلان بہت ہی زیادہ قابل تعریف تھا اور اس میں اس کو امید سے کہیں پہلے کامیابی حاصل ہو گئی۔

بروز دوشنبہ ۱۲ فروری کو آفتاب نکلنے سے قبل ایرانی افواج سرائے عظیم آباد سے روانہ ہوئی۔ شہر سے نو میل دور مشرق کی طرف سے نہر پار کی اور کرنال کے شمال مشرق میں چھ میل پر ایک میدان میں کیمپ پورا اور جمنا سے تھوڑا سا ہٹ کر خیمہ زن ہو گئی، جمنا سامنے دکھائی پڑتی تھی۔ خاص فوج کا ڈویژن یہیں پر قیام پذیر رہا، لیکن نادر شاہ حفاظتی دستہ کو لے کر شاہی فوج کی پوزیشن کا معائنہ کرنے کے لئے تیزی سے چل نکلا۔ شاہی فوج کی پوزیشن خیموں اور جھنڈوں کی وجہ سے گو کہ صاف یہاں سے نظر آ رہی تھی، لیکن نادر شاہ کچھ اور ہی اپنے دل میں رکھ کر فوج کی صحیح تقسیم و ترتیب کی دیکھ بھال کرنے کے بعد اپنے خیمہ میں واپس آ گیا۔

شام کو اس کے جاسوسوں نے خبریں دیں کہ "سعادت خاں شہنشاہ کی مدد کرنے کے لئے اودھ سے آ رہا ہے اور اس کے ساتھ تیس ہزار فوج اور توپ خانہ بھی ہے اور وہ اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ پانی پت تک آ گیا ہے، ایرانی فوج کے ایک دستہ کو اس کو روکنے کے لئے حکم دیا گیا، اور اسی رات کو ایک دوسرا دستہ مغل کیمپ کے مشرقی حصہ پر ایک کاری ضرب لگانے کے لئے روانہ کیا گیا، گو کہ اس سے پہلے ایرانیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ایک میل کے فاصلوں سے گشت کر رہی تھیں اور راستے کی رکاوٹوں کو بھی ہموار کر رہی تھیں۔

کرنال ۔ جنگ کیلئے ہندوستانیوں کا کوچ

آخر کار تقدیری آفتوں سے بھرپور اور تباہ کن دن کا آفتاب منگل ۱۳ فروری ۱۷۳۹ء کو طلوع ہوا، ایرانی فوج نے اپنی جگہ سے جمنا اور نہر علی مردان خاں کے درمیانی میدان کی طرف تین حصوں میں تقسیم ہو کر آگے بڑھنا شروع کیا، مرکزی فوج کی قیادت شاہزادہ نصر اللہ کے ہاتھ میں تھی اس کو حکم دیا گیا کہ "تم جمنا کے ساحل کی طرف سے پیش قدمی کرو۔ اور محمد شاہ کے کیمپ کے شمال کی طرف اپنی پوزیشن قائم کرو" ۔۔۔ شمالی حصہ کی نگرانی نظام کا ڈویژن کر رہا تھا، نادر شاہ بذات خود نہر کی طرف بڑھا اور وہیں ٹھہر گیا، یہاں پہونچ کر اس کو معلوم ہوا کہ "نصف شب کے قریب سعادت خاں شہنشاہ سے آ کر مل گیا ہے" وہ تھوڑا سا اپنے بائیں طرف ہٹا اور ایک کھلے ہوئے میدان میں جمنا سے ایک یا دو میل دور مغرب کی طرف اور دشمن سے تین میل دور مشرق کی طرف اپنے خیمے نصب کر دئیے۔ یہاں اس کا لڑکا اپنی مرکزی فوج کو لے کر پہنچ گیا، اس نقل و حرکت میں دن کا نصف حصہ گزر گیا اور جب آفتاب غروب ہونے کی طرف مائل ہونے لگا تو ایک دم سے ہندوستانی اپنی حدوں سے نکل کر جنگ کے لئے آتے دکھائی دئیے۔

یہ کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ یہ جاننے کے لئے شاہی کیمپ کے اندرونی حالات جاننا ضروری ہیں شہنشاہ کی مدد کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے سعادت خاں ۲۰ ہزار گھوڑ سوار، توپ خانہ اور دوسرے سامان جنگ کے ساتھ صوبہ اودھ سے روانہ ہوا اور پے در پے پیش قدمی کرتا ہوا ایک مہینہ کے اندر کرنال پہونچ گیا۔ وہ ۸ فروری کو دہلی پہونچ گیا تھا اور ایک دن قیام کر کے اس نے دہلی اور پانی پت کے ۵۵ میل فاصلہ کو تین دن کے اندر طے کر لیا تھا اور چوتھے دن ۱۲ فروری کو بڑی کوششوں سے باقی ماندہ ۲۰ میل طے کر کے نصف شب کو کرنال اپنی مرکزی فوج کے ساتھ پہونچ گیا، اس کا کیمپ اور دوسرا ساز و سامان بعد میں پہنچا۔

یہ لوگ ایسے راستے سے آئے تھے جس پر حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس وجہ سے ساز و سامان ایک دن کے بعد پہونچ سکا، ۱۲ فروری کو ایرانی فوج اپنے کیمپ سے ۲۲ میل آگے بڑھ کر آ گئی۔ تو سعادت خاں کے پانی پت آنے کی خبر ملی، ہندوستانیوں کا محکمہ جاسوسی ایسا بیکار اور نا اہل تھا کہ سعادت خاں کو دشمن کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا اور نہ ہی وہ لوگ اس کے ساز و سامان کو ہر ممکن حملہ سے بچانے کا انتظام ہی کر سکے، شہنشاہ خود بھی کرنال میں بالکل بے پرواہ پڑا ہوا تھا، جیسا کہ غلام علی لکھتا ہے کہ:

"لاہور سے کرنال کی طرف نادر کے آنے کی خبر کسی کو بھی شاہی کیمپ میں نہ مل سکی، یہاں تک کہ بنجارے جو ۶، ۷ میل دور چارہ لانے کے لئے گئے تھے اور زخمی حالت میں واپس آئے اور بہت ہی خوفزدہ حالت میں انھوں نے ایرانی فوج کی ایک ٹکڑی کے ساتھ اچانک اپنی جھڑپ کا حال سنایا، تو ایک دم سے ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی کہ نادر آ گیا ہے، نادر آ گیا ہے ۔۔۔ یہ سنتے ہی ساری فوج میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور سعادت خاں کے پہونچنے کا بڑی بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔"

۱۲ فروری کو جب سعادت خاں نصف شب کے قریب کرنال پہونچ گیا تو خان دوراں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اپنے حدود میں لے آیا۔ صبح کے وقت اس نے شہنشاہ سے ملاقات کی۔ تکریمی خطابات اور تواضع کے تبادلہ کے بعد شہنشاہ کی موجودگی میں فوراً جنگی کونسل منعقد ہوئی اور ابھی جنگ کے طریقوں کے متعلق بحث چل رہی تھی کہ خبر پہونچی کہ "ایرانیوں کے ہراول دستوں نے سعادت خاں کے ساز و سامان سے لدے ہوئے اونٹوں پر حملہ کر دیا ہے اور ۵ سو اونٹ سامان سے لدے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

سعادت خاں نے شہنشاہ کے سامنے قالین پر رکھی ہوئی اپنی تلوار اٹھائی اور ایرانیوں سے جنگ کی اجازت طلب کی، نظام نے مشورہ دینے میں تاخیر سے کام لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ: "اودھ کے سپاہی ایک مہینے کی مسلسل مسافرت سے تھک گئے ہیں، ان کو ایک دن کی مہلت آرام کی دی جائے، تاکہ وہ دوبارہ چاق چوبند ہو جائیں۔"

(باقی آئندہ)

یورپ میں اسلام کا داخلہ

اور اس کے اسباب

محمود الازہار ندوی

بنی امیہ نے مشرق میں ۹۱ سال تک مسلمانوں کی دینی و دنیاوی قیادت کی اس مختصر مدت میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اسلامی مملکت کی حدود کو جس قدر وسعت دی وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ اس کے دور حکومت کی اسلامی حدود کی وسعت، مشرق میں چین اور مغرب میں فرانس اور شمال میں   اور جنوب میں یمن تک پہنچ گئی تھی۔

یورپ میں رومن امپائر کے اثر و اقتدار کا خاتمہ وحشی اقوام کی بربریت کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف سلطنت بازنطینی کے موروثی سلاطین اور امراء و روسا تھے جن کے مزاج میں عیش پسندی اور اخلاقی کمزوریاں دخل پا گئیں تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگ ونڈال گاتھ اور لمبارڈی قوموں نے سارے یورپ کو روند ڈالا اور یورپ کے مختلف حصوں کو اپنے اثر و تصرف کا مرکز بنا لیا قوم گاتھ کی دو شاخیں ہو گئیں تھیں۔ ایک نے مشرقی یورپ میں اپنے قدم جمائے تھے اور ان کو مشرقی گاتھ کہا جاتا ہے اور دوسری شاخ نے اسپین میں قدم جمایا اور ان کو مغربی گاتھ کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے جب اندلس فتح کیا ہے تو اس وقت سرزمین اندلس پر ان ہی مغربی گاتھوں کا قبضہ تھا جو کلیسا روما کے اثر سے عیسائی ہو گئے تھے۔ سلطنت و حکومت اور دولت کے اقتدار کے نشے نے ان میں بھی وہی کمزوریاں پیدا کر دی تھیں جو عام طور پر حکمرانوں اور فرمانرواؤں میں پائی جاتی ہیں۔

سلطنت اسپین کا دربار جوڑ توڑ اور سازش کا مرکز ہو گیا تھا اور اسی کے نتیجہ میں رازریق نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تخت و سلطنت کے موروثی حقدار غیطشہ کو قتل کر کے اسی سال کی عمر میں خود تخت و سلطنت پر قابض ہو گیا لرزیق جس کو انگریزی میں راڈرک کہا جاتا ہے۔ لرزیق اس غاصبانہ اور عیارانہ حرکت سے خاندان شاہی اور سابق شہنشاہ کے وفادار امراء و روسا مطمئن نہیں تھے اور دل ہی دل میں اس کے خلاف آتش انتقام بھڑک رہی تھی۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ اندلس کے سرحدی صوبے کا گورنر کاونٹ جولیان تھا جو دینی انتظامی صلاحیت اور فوجی لیاقت میں ایک بلند درجہ رکھتا تھا اور درحقیقت اس کی دانائی اور لیاقت تھی کہ بربر قوموں کو جو مسلمان ہو چکی تھیں سرحد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا کاونٹ جولیان سابق شہنشاہ کا داماد اور اس کی لڑکی فلورنڈا سابق شہنشاہ کی نواسی تھی۔ جولیان نے اس عہد کے دستور اور رواج کے مطابق اپنی صاحبزادی کی تعلیم و تربیت اور شاہی مجلسوں کے عادات و اطوار سیکھنے کے لئے طلیطلہ شاہ لرزیق کے محل میں بھیج دیا۔ لرزیق اپنے منصب و اہمیت کو نظر انداز کر کے کاونٹ جولیان کے شرف کو داغدار کر دیا۔ یعنی اپنی سرپرستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لرزیق نے کاونٹ جولین کی لڑکی فلورنڈا کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا دیا۔

کاونٹ جولین کی باعزت صاحبزادی نے لرزیق کی اس مجرمانہ خیانت کی اطلاع اپنے باپ کاونٹ جولین کو دے دی۔ صاحب وجاہت اور خاندانی شرف و اعزاز والے اشخاص پر ایسے وقت میں جو تاثر و کیفیت ہونی چاہیے وہی اثر کاونٹ جولین پر بھی ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے شرف و وقار کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔ کاونٹ جولین پہلے سے بھی اپنے   کو اپنے خسر کا قاتل اور تخت و سلطنت کا غاصب سمجھتا تھا۔ لیکن کسی قوی ہمسایہ سلطنت کے نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً اس نے اپنا تعلق اسپین کے تخت سے قائم رکھا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اس نے یہ طے کر لیا کہ لرزیق کی حمایت و مدافعت سے دستبردار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ طلیطلہ لرزیق کے پاس پہونچا اور اظہار تعلق اور وفاداری کے بعد اپنی لڑکی کو واپس لے جانے کی درخواست کی۔ لرزیق نے اجازت دے دی اور اپنے مرکزی مقام اپنی لڑکی سمیت واپس آ گیا۔

ایک قصہ یہ بھی مشہور ہے کہ جب کاونٹ جولین لرزیق سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ کاونٹ جولین سے لرزیق نے مطالبہ کیا تھا کہ تمہارے علاقے کے باز بہت مشہور ہیں کچھ شکاری باز میرے یہاں بھیج دینا۔ کاونٹ جولین نے کہا تھا آپ اطمینان رکھئے میں آپ کی خدمت میں ایسے باز بھیجوں گا جو بہت دنوں تک یاد رہیں گے اس جملہ کے در پردہ مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کی ترغیب کی طرف اشارہ تھا۔

اسپین کے یہ حالات تھے جب مسلمانوں نے اسپین کی فتح کا ارادہ کیا تو مغربی ایشیا اور افریقہ کے قبضہ میں آنے کے بعد اس وقت کے معلوم براعظموں میں صرف یورپ ہی ایسا خطہ تھا جہاں ابھی تک مسلمان نہیں پہونچے تھے یورپ کی کنجی اور ایشیا اور یورپ کے درمیان بین الاقوامی شاہراہ کا مرکز قسطنطنیہ تھا حضرت عثمان کے زمانہ ہی سے قسطنطنیہ کو مسلمان فتح کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک سمجھ میں آتا ہے قسطنطنیہ پر بار بار حملہ اور اسے فتح کرنے کی کوشش کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) پہلی وجہ آنحضور صلعم کی وہ حدیث شریف ہے جس میں مسلمانوں کو فتح قسطنطنیہ کی بشارت دی گئی ہے اور فاتح فوج کے متعلق کلمۂ خیر فرمایا گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان کے عہد سے لیکر ایک طویل مدت تک حوصلہ مند خلفاء اور سپہ سالار نے قسطنطنیہ فتح کرنے کی کوشش کی تاکہ آنحضور صلعم کی اس دعا خیر کا مصداق وہ بنیں اور آنحضور صلعم کی پیشین گوئی ان کے ہاتھ سے پوری ہو۔

فتح قسطنطنیہ کی دوسری وجہ سمجھ میں یہ آتی ہے کہ اس وقت قسطنطنیہ یورپ اور ایشیا کے درمیان مرکزی شاہراہ پر واقع تھا اور یورپ جانے کے لئے خشکی کا راستہ قسطنطنیہ تھا۔ اس لئے قسطنطنیہ یورپ میں داخلہ کی کنجی تھا بغیر قسطنطنیہ فتح کئے ہوئے مسلمان اپنا دینی پیغام یورپ میں نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر تجربات نے یہ بتلا دیا کہ قسطنطنیہ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ناقابل تسخیر ہے اور چاروں طرف سے سمندر میں محصور ہونے کی وجہ سے قسطنطنیہ والے اپنی تھوڑی سی تعداد کے ذریعے بڑے سے بڑے اور طاقتور حملہ آوروں کو پسپا کر سکتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں نے اس عام شاہراہ کو چھوڑ کر پورا افریقہ طے کر کے اسپین کی راہ سے یورپ میں داخلہ کی کوشش کی۔ موسیٰ بن نصیر کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے یورپ اور قسطنطنیہ کی فتح کے لئے ایک طویل مگر زیادہ ممکن اور بہتر تجویز کا منصوبہ تیار کیا اس کا خیال تھا کہ اسپین کی فتح کے بعد کوہ پرنیز کو عبور کر کے فرانس میں داخل ہوگا اور مشرقی یورپ کو فتح کرتے ہوئے یورپ کی طرف سے قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا اگر اس کا یہ منصوبہ خود اس کے زمانہ یا

بقیہ انٹرویو

میرا یہ سوال کرنا تھا کہ مولانا پر ایک افسردگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور دل کی بے چینی اور ایک انجام غم کے اثرات چہرہ بشرہ سے صاف عیاں تھے۔

درد بھرے لہجے میں مولانا نے فرمایا کہ مشرق وسطیٰ کا مطلع ابھی گرد آلود ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا ہو اس سلسلہ کی بھی کچھ تفصیل۔ مغربیت اور مشرقیت کی کشمکش میں موجود ہے۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ آواز قریب سے نہیں بلکہ دور بہت دور سے آ رہی ہے اسی لئے فوراً ہی اس موضوع سے ہٹتے ہوئے میں پوچھ بیٹھا کہ آپ کو اپنی تصنیفات میں سے کس تصنیف سے زیادہ لگاؤ ہے اور اس کو آپ پسند کرتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ اردو میں تو سیرت سید احمد شہیدؒ اور تذکرہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی اور تاریخ دعوت و عزیمت ہے اور عربی میں روائع اقبال اور النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن ہے۔

میں نے اپنی نوٹ بک دیکھی صرف دو سوال اور رہ گئے اور وقت اب بالکل نہیں رہ گیا تھا اس لئے کچھ ڈرتے ہوئے اور کچھ جھجکتے ہوئے پوچھ ہی بیٹھا۔

مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحبؒ کی شخصیت کے بارہ میں آپ کا عمومی تاثر کیا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ بھائی صاحب کی حقیقت پسندی سلامت ذہن، متوازن مزاج، سنجیدگی اور پختگی سے بہت متاثر ہوا، اور علمی شغف سے بھی۔ اس موقعہ پر مجھے والد صاحب کا وہ جملہ یاد آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب کو لوگوں نے پہچانا نہیں ان کا اصل ذوق علمی تھا اور ان کے اندر رسالہ فہمی بھی بہت زیادہ تھی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ابن تیمیہ اور ابن قیمؒ کی کتابوں کی طرف التفات مجھ کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہدایات کے بموجب ہی ہوا۔

مولانا عربی مدارس کے اساتذہ کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے اور طلباء کی کردار کی تعمیر میں ان کو کن اقدامات کی ضرورت ہے نیز عربی مدارس سے فارغ طلباء کے معاشی استحکام کے بارے میں آپ کے نزدیک اصل حل کیا ہے۔ چونکہ عشاء کی اذان ہو چکی تھی اس لئے میرے اس طویل سوال کا جواب مختصر طور پر دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ اساتذہ کو طلباء کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ رکھنا چاہیئے اور ہر ممکن طریقے سے مختلف اوقات میں علمی ذوق اور مطالعہ کی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور سب سے بڑھکر دینی روح اور دعوتی رنگ پیدا کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہیئے اور جہاں تک سوال ہے فارغ طلباء کے معاشی استحکام کا تو بھائی اس کی تین ہی صورتیں ہیں یا کوئی ہنر سیکھا جائے اور اس کو ذریعہ معاش بنایا جائے یا خود کو توکل پر چھوڑ دینا چاہیئے یا پھر اللہ کی راہ میں انسان لگ جائے تو وہ خود ہی بندوبست کرتا ہے۔

اس کے بعد ہم سب عشاء کی نماز کے لئے چلے گئے۔

رات کے تین بجے اچانک میری آنکھ کھل گئی کمرہ سے باہر نکل آیا ہر چہار طرف ایک پاکیزہ اور خوشگوار سناٹا چھایا ہوا تھا اور پورا چاند آسمان کی وسعتوں میں چمک رہا تھا۔ کھیتوں اور باغات اور دریا کے درمیان گھرے ہوئے تکیہ کے یہ چند گھر اور یہ مسجد اپنی کہانی سناتے ہوئے محسوس ہوتے سید احمد شہیدؒ کے مجاہدانہ کارنامے اور ان کے ساتھیوں کی سرفروشانہ جد و جہد نگاہوں کے سامنے تصویر کی طرح پھرنے لگی۔ اللہ اللہ اس قدر عظیم تھی یہ تحریک جو آندھی اور پانی کی طرح اٹھی تھی اور سارے ہندوستان میں چھا گئی تھی اور آج اسی خاندان کا ایک فرد پھر تن من دھن سے اسلام کی حمایت میں نکل آیا ہے۔ اور سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کی سنت تازہ کرنے میں مصروف ہے۔ مبارک ہو تجھ کو اے ملت اسلامیہ ہند کہ تجھ کو اس باعظمت خاندان کے عظیم فرزند کی رہنمائی حاصل ہے۔

بقیہ تبت پر چینی حملہ

جس پر چینیوں نے ان بچوں کے سرپرستوں کو طرح طرح سے ستانا شروع کیا، ان کو مختلف طریقوں سے پریشان کرنے لگے تنگ آ کر تبتیوں نے جنگ کرنے کی ٹھانی اور ایک بڑی فوج کی تیاری شروع کر دی۔

چینی اس سے بخوبی واقف تھے کہ یہ وقت آنے والا ہے اس لئے وہ اس کے لئے پہلے سے تیار تھے، قبل اس کے کہ تبتی کوئی اقدام کرتے انہوں نے ایک لشکر جرار تبت میں اتار دیا، جس نے تبت میں قتل عام شروع کر دیا، تبت کے جنگجو قبیلے نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ایک ایک کھمپا نے سیکڑوں چینی مارے، لیکن ان کی تعداد کم تھی اس لئے انہیں پسپا ہونا پڑا، اور چینی تبت کے اندر گھس آئے، جنگ بدستور جاری رہی چینیوں نے ہندوستانی   پر فائرنگ کی جس سے اس کی عمارت بہت مخدوش ہو گئی   محصور ہو کر رہ گیا کھمپا اب بھی بڑے زوروں سے حملے کر رہے تھے، لیکن چینیوں کی تعداد اتنی کثیر تھی کہ وہ چینیوں کو مارتے مارتے اکتا جاتے اس لئے چینی برابر آگے بڑھتے گئے۔ اور بڑھکر دلائی لاما کے فدائیوں نے ان کے محل کو روکا، لیکن ایک ایک کر کے سب دلائی لاما پر قربان ہوتے گئے۔

دلائی لاما کو اپنی شکست کا یقین ہو چکا تھا، اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر جنگ بند نہ ہوئی تو تمام تبتی قتل کر دیئے جائیں گے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جنگ اسی صورت میں بند ہو سکتی ہے جبکہ میں قتل ہو جاؤں یا تبت چھوڑ دوں، اسی نے مناسب یہی سمجھا کہ تبت چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ لی جائے تاکہ آنے والے تبتی باشندوں کے لئے رہائش کا انتظام ہو سکے اور تبتی کمیونسٹ ہونے سے بچیں۔

انہیں اسباب کے پیش نظر "دلائی لاما" نے ۱۷ مارچ ۱۹۵۹ء کو خفیہ طریقے سے اپنے محبوب وطن کو الوداع کہا، اور ہندوستان کی راہ لی، راستے میں اسے سیکڑوں مصائب کا سامنا کرنا پڑا نہ معلوم کتنا سفر اسے پاپیادہ طے کرنا پڑا، بہت سا سفر پیدل طے کرنا پڑا، وہ سنگلاخ و برفیلے علاقے طے کرتا ہوا کسی طرح تیزپور پہونچا، وہاں اس نے ایک بیان دیا جس میں تبتیوں کے مصائب اور انسانیت سوز مظالم کا ذکر تھا، پھر ہندوستان سے تبتی باشندوں کی رہائش کے لئے گفت و شنید کی۔

چینی درندوں کو جب "دلائی لاما" کے فرار کی اطلاع ملی تو وہ ہاتھ مل کے رہ گئے انہوں نے ہر سرحدی چوکی پر پولیس اور فوج کی ایک بڑی تعداد تعینات کر دی تاکہ دلائی لاما کو زندہ گرفتار کر لیا جائے، چینی فوج تبت کے ہر گلی کوچہ میں گشت کرنے لگی، دلائی لاما کو زندہ گرفتار کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

آج سے تبت تبتیوں کا نہیں، بلکہ وہ اب کمیونسٹ چین کا ہے۔ اب تبتی قوانین تبت میں نافذ نہ ہوں گے بلکہ تبتی باشندوں کو چینی قوانین کا پابند ہونا پڑے گا۔

اس منحوس دن سے آج تک برابر تبت چینی درندوں کے پنجے میں جکڑا ہوا ہے، وہ اس کے سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے، انھوں نے تبتی باشندوں کو طرح طرح کی تکالیف دینی شروع کیں، بیٹے کو باپ کے سامنے بیٹی کو ماں کے سامنے ... کو بیٹی کے سامنے، بہن کو بھائی کی موجودگی میں قتل کر دیا ... بہت بڑی تعداد میں تبتی عوام ہجرت پر مجبور ہو گئے، اور ... ہندوستان کے دامن میں پناہ لی، ہندوستانیوں نے ... استقبال کیا، ان کے رہنے کا انتظام کیا، ان کے لئے ... کی سہولتیں فراہم کیں، لیکن افسوس کہ وہ اس وقت ... تماشا دیکھتے رہے جب تبت پر انسانیت سوز مظالم کئے جا رہے تھے ... ورنہ شاید تبتی عوام کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا اور تبت آزاد اور مطمئن ہوتا، اور دنیا کے ملکوں کی برادری میں ایک باعزت فرد ہوتا۔

بقیہ اداریہ

ستونوں کی بدولت قائم ہے اور اس کی زندگی اور قوت کا راز انکی میں مضمر ہے اس لئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے دوروں کا کیا حال ہوگا، جہاں مولانا تشریف لے جاتے وہاں پہلے سے بہت اہتمام کیا جاتا اور ہزاروں لاکھوں آدمی ذوق و شوق سے جلسوں میں شریک ہوتے اور مولانا کی طویل تقریریں سنتے، سیکڑوں جماعتیں باہر نکلتیں اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جاتیں۔

مولانا اگر کسی کام کے آدمی کو دیکھ لیتے اور اس کی کوئی صلاحیت ان کے علم میں آتی تو وہ بے چین ہو جاتے کہ کس طرح اس کو تبلیغ کی طرف متوجہ کرلیں۔ اچھی انگریزی جانتا ہوتا تو چاہتے کہ کسی طرح وہ تبلیغ میں لگ جائے اور اس کو یورپ کے کسی ملک یا امریکہ بھیجدیں، اچھی عربی جانتا ہوتا تو چاہتے عرب ممالک میں تبلیغ کے لئے بھیجدیں اسی طرح انتظامی صلاحیت اور عقل و فراست جس میں جو بھی خوبی ہوتی مولانا دیکھ کر بے چین ہو جاتے کہ یہ دین کے کام کیوں نہیں آ رہی ہے۔

مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت اور ان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ و رسول پر دل و جان سے قربان ہونا کس کو کہتے ہیں۔ اس کے راستہ میں اپنے کو مٹانے اور مٹا کر خوش ہونے میں کیا لذت ہے۔ وہ کیا "بات" ہے جو جب کسی کو حاصل ہوتی ہے تو زندگی بدل کر رکھدیتی ہے۔ پھر اس راہ کا گرد و غبار اسکو نسیم سحری سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ راستے کے کانٹے مہکتے ہوئے پھول بن جاتے اور اور لوگ کے تھپیڑے اپنے ساتھ "بوئے دوست" لاتے ہیں، پھر آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے اور اس کو صرف ایک بات یاد رہتی ہے اور اس میں وہ اس طرح مست و سرشار رہتا ہے کہ پھر کوئی دنیاوی لذت، عارضی دولت اور وقتی منفعت اس کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

کسی طرح اس کی فکریں ایک نکتہ میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور نگاہیں ہر طرف سے ہٹ کر ایک "رخ زیبا" پر مرکوز ہو جاتی ہیں، کس طرح اس کا سینہ حسد سے عداوت سے تکبر سے، انانیت سے خود غرضی سے اور تمام رذائل سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اس کو کسی اور طرف رخ کرنے کی فرصت ہی باقی نہیں رہتی۔ کس طرح وہ اپنے وجود اپنے جسم اپنے دل، اپنی نگاہ، اپنے وقت، اپنے مال اور اپنے اہل و عیال سب کے ساتھ پروانہ کی بیتابی لئے ہوئے اور بلا کسی ملامت کی پرواہ کئے ہوئے اپنے محبوب و مطلوب پر نثار ہو جاتا ہے۔

اللہ کے اس بندے پر مرض کا حملہ بھی اس حالت میں ہوا کہ وہ تقریر کر رہا تھا اور انتقال کے بعد یہ شان

تھی کہ جنازہ تیار ہے اور جماعتوں کی تشکیل بھی ہو رہی ہے اور ہدایات بھی دی جا رہی ہیں، فضا غم سے بوجھل ہے لیکن دین کے قافلے پرعزم قدموں کے ساتھ اپنے راستہ پر رواں دواں ہیں اور وہ کام جس کے راستہ میں اس نے جان دے دی اسی قوت لیکن سکون اور خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔

محبت کے دعویداروں اور اس جنس نایاب کے خریداروں کے لئے مولانا کی زندگی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں وہ عشق کی بولتی ہوئی تصویر دیکھ سکتے ہیں اور اپنے "سفر خوباں" کے لئے سامان نشاط فراہم کر سکتے ہیں۔

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک رات میں یہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

بقیہ یورپ میں اسلام کا داخلہ ....

کرے گا اگر اس کا یہ منصوبہ خود اس کے زمانہ یا اس کے بعد کامیاب ہو گیا ہوتا تو آج دنیا اور خاص کر یورپ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی اور یہ وہ عہد تھا جبکہ یورپ اگرچہ بڑی حد تک عیسائیت قبول کر چکا تھا لیکن پھر بھی ابھی یورپ کا اچھا خاصہ حصہ اپنے مشرکانہ اور آبائی دین پر تھا اور پورے یورپ میں مذہبی اور سیاسی انتشار کی آندھی چل رہی تھی اس لئے ہمارا قیاس و اندازہ ہے کہ اگر اس وقت یورپ میں اسلام داخل ہو جاتا تو وہ قسطنطنین اعظم کی عیسائیت کو شکست دیدیتا اور روما کے لاٹ پادری کی مذہبی اجارہ داری کو چیلنج کرتا مگر افسوس کہ یہ نہ ہوا اور نہ ہونے کے اسباب کی داستان بڑی طویل اور انتہائی افسوسناک ہے

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات

۳۰ اپریل ۶۵ء کو مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت تبلیغ نے لاہور میں انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا فروری کے دوسرے ہفتہ ایک طویل دورہ پر پاکستان تشریف لے گئے تھے۔ ۳۱ مارچ بدھ کے روز ایک تبلیغی اجتماع کے بعد طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ دوسرے روز مولانا انعام الحسن صاحب سے دوران گفتگو میں اس طرح کا اشارہ فرمایا کہ گویا اب وقت آخر ہے۔ مولانا انعام الحسن صاحب نے فرمایا کہ ابھی تو بہت سے ممالک باقی ہیں۔ امریکہ میں ابھی کام پوری طرح نہیں ہو سکا ہے۔ فرمایا کہ میں نے کام کا نمونہ چھوڑ دیا ہے اب اسکو آگے بڑھانا تم لوگوں کا کام ہے۔ اسی گفتگو کے معاً بعد ایک اجتماع میں تشریف لے گئے اور اس سے واپسی کے بعد بیہوش ہو گئے۔ جمعہ کے روز حالت نازک ہو گئی، اسپتال لے جانے کی کوشش کی گئی تو یہ فرمایا کہ وہاں نرسیں ہوتی ہیں۔ وہاں میں نہ جاؤں گا۔ جب اس کا انتظام کر دیا گیا اور اطمینان دلا دیا گیا کہ نرسیں ہٹا دی جائیں گی تو روانہ ہوئے راستہ بھر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے اسپتال پہنچنے سے دو منٹ پہلے وہ وقت آ گیا جسکا اندیشہ تھا بلند آواز سے اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ پڑھا اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔

حضرت مولانا کے بعد اس کام کے ذمہ دار مولانا انعام الحسن صاحب مقرر کئے گئے جو مولانا محمد الیاس صاحب کے خلیفہ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے داماد ہیں۔ نماز جنازہ شیخ الحدیث مدظلہ نے پڑھائی۔ نعش لاہور سے بذریعہ طیارہ دہلی لائی گئی اور حضرت مولانا محمد الیاس کے دائیں پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔

اپیل دارالعلوم ندوۃ العلماء

دارالعلوم ندوۃ العلماء ہندوستان کا مشہور و معروف دینی مدرسہ ہے جہاں دور دراز سے طلبہ تحصیل علم کیلئے آتے ہیں اور فراغت کے بعد اپنے اپنے مقام پر دین کی خدمت کرتے ہیں، ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جنکے قیام و طعام کا انتظام دارالعلوم ہی کو کرنا پڑتا ہے۔

دارالعلوم میں بفضلہ تعالیٰ اسوقت نوسو پچاس طلبہ تعلیم پا رہے ہیں، دارالعلوم میں (۵۵۰) شعبۂ مکتب (۴۰۰) ان میں سے ۳۷ غیر ملکی ہیں اور (۷۵) طلبہ ایسے ہیں جنکے طعام کا بھی دارالعلوم متکفل کرتا ہے۔ طلبہ کے قیام اور دیگر اہم ضرورتوں کی وجہ سے تین سال سے تعمیرات کا کام بھی ہو رہا ہے ۴۴ اساتذہ حضرات خدمت میں مصروف ہیں، مجموعی سالانہ مصارف دارالعلوم کے مع تعمیرات تین لاکھ روپے ہیں۔ یہ تمام خرچ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اہل خیر اور درد مند مسلمانوں کے تعاون سے پورا [illegible] جا رہا ہے۔

ان مہمانان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی ضروریات رفع کرنے پر آپ اپنی پاک کمائی کا جتنا بھی زائد سے زائد حصہ صرف کریں گے اس کا سات گنا ثواب آپکے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ خصوصیت کے ساتھ تجارت پیشہ و زراعت پیشہ بھائیوں سے درخواست ہے کہ اعانت میں بیش از بیش حصہ لیں اور نقد یا غلہ سے مدرسہ کی مدد کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ علوم دین کے طلبہ مدرسہ سے تعلیم حاصل کر کے اس پر آشوب زمانہ میں مسلمانوں کی اور علوم دین کی خدمت کے قابل ہو سکیں۔

ابو الحسن علی ندوی ، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پرنٹر پبلشر محمد الحسنی نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع کیا